بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل!!!

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفاً تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا، نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ. اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ (العنكبوت: ۵۷، ۵۸، ۵۹)

ترجمہ: ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم سب کو ہمارے پاس آنا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم ان کو جنت کے بالا خانوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے۔ جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر توکل کیا کرتے تھے۔

یہ دنیا فانی ہے اور اس کی ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے، اس کی کوئی چیز باقی، دائمی اور ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ. وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (جتنے روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جاویں گے۔ اور آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت اور احسان والی ہے باقی رہ جائے گی) باقی رہنے والی ذات صرف خداوند قدوس کی ہے، وہی خالق کائنات ہے، قضا وقدر کا مالک ہے، اسی کے ہاتھ میں زمین وآسمان کی بادشاہت ہے، ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، کوئی چیز اس کی قدرت اور دائرۂ اختیار سے باہر نہیں، بڑے سے بڑا انسان ہو اور پوری دنیا کی بادشاہت مل جائے، تب بھی اس کی حیثیت ذرۂ بے مقدار سے زیادہ نہیں۔

انسان کو اس دنیا میں اس کے خالق اور پروردگار نے ایک مقرر وقت تک کے لیے بھیجا

ہے،اوراس لیے بھیجااور پیدا کیا ہے تاکہ اس کا امتحان لے کہ کیسا عمل کرتا ہے، اچھا کام کرتا ہے یا برا کام کرتا ہے۔ خدا کے سامنے سر اطاعت خم کر کے زندگی اس کی مرضی کے مطابق گزارتا ہے، یا اس کے حکم سے سرتابی کرتا ہے، اور سرکشی ونافرمانی کی خو ڈالتا ہے۔ اچھا کام کیا تو دنیا میں بھی سکون واطمینان اور آسودگی کی نعمت سے بہرہ مند ہوگا، اور مرنے کے بعد بھی لافانی اور کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتیں اس کا مقدر ہوں گی، وہ نعمتیں جن کے بارے میں خدا کے آخری اور سچے پیغمبر رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم خداوند کریم کی طرف سے یہ مژدۂ جانفزا سناتے ہیں: **أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لاعَيْنٌ رَأَتْ، وَلا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَتْ عَلَى قَلْبِ بَشَر** (خدا کا ارشاد ہے کہ: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے سنا ہے، اور نہ کسی انسان کے دل پر ان کا خیال گزرا ہے) اور خالق کائنات نے خود اپنے پاک کلام میں فرمایا ہے: ﴿**فَلا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ**﴾ اس لیے عقل مند درحقیقت وہی ہے جو اُس زندگی کے آرام وآسائش کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلے، جس زندگی پر فنا طاری ہونے والی نہیں ہے، ارشاد نبوی ہے: **الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الموتِ** (ہوشیار وہ ہے جو اپنے آپ کو اطاعت گزار بنادے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے)۔

اس دنیا میں آنے جانے والوں کا ایک سلسلہ لگا ہوا ہے، آنے والے آرہے ہیں اور جانے والے قطار اندر قطار چلے جارہے ہیں، جس طرح کوئی تسبیح کا دھاگہ یا موتیوں کا قلادہ ٹوٹ جائے، اور وہ موتیاں یا تسبیح کے دانے ایک ایک کر کے گرتے جائیں، اسی طرح ہماری قومی وملی اور دینی وعلمی ہستیوں کا رشتہ ایک ایک کر کے ان کے تارنفس سے منقطع ہورہا ہے، اور وہ ہم کو غم زدہ اور اداس چھوڑ کر عالم آخرت کی طرف روانہ ہوتے جارہے ہیں، اور ہمارے قومی وملی جسم کا ایک زخم ابھی بھرتا نہیں کہ دوسرا زخم لگ جاتا ہے۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ اس رسالے کے مدیر تحریر اور اس کے خشت اولین حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب - جن کو اب دل پر پتھر رکھ کر نور اللہ مرقدہ لکھنا پڑ رہا ہے - اپنے جسم وجان کے ساتھ ہمارے درمیان تھے اور ہم ان کی ذات گراں مایہ سے بہرہ مند اور فیض یاب ہورہے تھے، اور

ان کی حوصلہ مندی وقوت ارادی اور رواں دواں زندگی سے درس ونصیحت حاصل کر رہے تھے۔

مولانا ایک جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے، ان کی ذات میں متنوع صفات وخصوصیات جمع ہوگئی تھیں، وہ بیک وقت ایک کامیاب تجربہ کار مدرس تھے، دل ودماغ پر سحر طاری کردینے والے واعظ اور مقرر تھے، مشاق قلم کار اور کہنہ مشق مصنف تھے، بہترین اور باکمال مربی تھے۔ عبادت گزار، زاہد شب زندہ دار اور شریعت وطریقت کے جامع تھے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو آج کل مجموعی طور پر کسی ایک شخص کے اندر کم نظر آتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے علماء وصلحاء کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ع

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

مولانا کو بہت ساری خصوصیات کے ساتھ اللہ رب العزت نے جو ایک بڑی نعمت عطا فرمائی تھی، وہ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں ان کی مقبولیت تھی، ملک کا اور خاص طور سے ضلع اعظم گڈھ کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مولانا کا بہت قدردان تھا۔ اور ان کی قربت کو اپنے لیے جانفزا، اور روح پرور محسوس کرتا تھا، اور جو ان کے قریب ہوتا وہ بہت جلد ان سے مانوس ہو جاتا تھا۔

مولانا کی پوری زندگی علم ودین کی خدمت میں گزری ہے، زمانۂ طالب علمی کے بعد سے وہ درس وتدریس کے مشاغل سے وابستہ ہوگئے تھے، وہ جہاں رہے شمع محفل بن کر رہے، جن مدارس میں درس دیا ان کے طلبہ کے مرکز توجہ بنے رہے، ان سے شراب علم کشید کرنے والے طلبہ، وتلامذہ ان کے گرویدہ وشیفتہ ہوتے۔ ان سے فیض یاب ہونے والے طلبہ بڑی تعداد میں ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں، اور علم ودین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

جن اداروں اور مدرسوں کی مسند درس کو مولانا نے زینت اور رونق بخشی، ان میں مدرسہ دینیہ غازی پور، وصیۃ العلوم الہ آباد اور ریاض العلوم گورینی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان مدارس میں انھوں نے درس وافادہ کی وہ محفلیں آراستہ کیں جن سے بہت سے طالبان علوم دینیہ فیض یاب ہوئے۔ اس کے بعد ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں شیخو پور کے مدرسہ شیخ الاسلام کی مسند صدارت پر متمکن ہوئے، اور اس کی آبیاری وگل کاری میں زندگی کے بیش قیمت تقریباً ۲۲؍برس صرف کردیے، اس کی تعمیر وترقی کے لیے انھوں نے اپنی بہترین توانائی صرف کی، حتی کہ مدرسہ شیخ الاسلام اور مولانا ایک

دوسرے کے لیے لازم وملزوم سمجھے جانے لگے، لیکن افسوس کہ چند مہینے پہلے کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مولانا نے اس کو خیر باد کہہ دیا، اور مئو ضلع میں چریا کوٹ کے قریب ایک گاؤں چھپرا کو اپنی سکونت اور صدائے ھوحق کے لیے منتخب کیا، وہاں پہلے ہی سے مولانا کی سرپرستی میں ایک مدرسہ سراج العلوم قائم تھا، اسی کی تعمیر وترقی کا خاکہ بنا کر مولانا نے اس کو اپنا مرکز اور مستقر بنایا، اور اپنے چند مخلص اور جاں نثار شاگردوں کو لے کر اس خاکے میں رنگ بھرنا شروع کر دیا تھا، اور یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ: ؎

منعم بدشت وکوہ وبیابان غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد وبارگار ساخت

اور مولانا کی پُرکشش اور بلند قامت شخصیت کو دیکھ کر یہ امید کی جانے لگی تھی کہ: ؎

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی پیمانہ بنے

لیکن واحسرتا کہ چند مہینے بھی نہیں گزرے کہ اس محبوب حقیقی کی بارگاہ سے مژدۂ وصال آپہنچا جس کی یاد اور جس کے ذکر وفکر میں وہ رطب اللسان رہا کرتے تھے، اور جس کے دین کی خدمت کو انھوں نے اپنا نصب العین بنا رکھا تھا، اور چھپرا کو زبان حال سے یہ کہنا پڑا: ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم وبہار آخر شد

مولانا کے فیوض وبرکات میں – جو امید ہے کہ انشاء اللہ ان کے لیے باعث اجر وثواب اور ذخیرۂ آخرت ثابت ہوں گے – ان کا وہ درس قرآن ہے جو اعظم گڈھ شہر کی جامع مسجد میں ہر یکشنبہ کو منعقد ہوا کرتا تھا، اور جس میں شہر کا بہت بڑا طبقہ خاص طور سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بہت پابندی سے شریک ہوا کرتا تھا، اس سے نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا ہوگا، اور ان کی شخصیتوں پر دین ومذہب کا رنگ چڑھا ہوگا۔

۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶ر مارچ ۱۹۹۲ء کو جب محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ وفات پیش آیا، اور اس سانحہ سے علم وتحقیق کی دنیا میں ایک زبردست خلا محسوس کیا جانے لگا اور علم وتحقیق سے شغف رکھنے والوں کو یہ دنیا ویران نظر آنے لگی، تو

آپ کے افادات اور علمی و تحقیقی نگارشات کو جاری وساری رکھنے اور اہل علم تک ان کو پہنچانے کے لیے آپ کے فرزندار جمند اور خلف الرشید حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ العالی نے آپ کی یادگار میں ایک رسالہ جاری کرنے کا پروگرام بنایا، آپ کے اس پروگرام اور ارادے سے نہ صرف اتفاق کیا گیا، بلکہ اس کو بنظر استحسان دیکھا گیا، اور اسے علم و تحقیق کی دنیا کے لیے فال نیک سمجھا گیا، اس پر سب سے زیادہ خوشی کا اظہار حضرت محدث کبیرؒ کے اولین شاگرد اور عمر بھر کے رفیق ومصاحب حضرت مولانا عبدالجبار صاحب نوراللہ مرقدہ -متوفی ۱۷ر رجب ۱۴۱۴ھ = ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۳ء- نے کیا، رسالے کا اجراء جب طے ہوگیا اور اس کے لیے لائحۂ عمل بن کر تیار ہوگیا، تو اس کے مدیر تحریر کی حیثیت سے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی نگاہ انتخاب حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب پر پڑی، اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھی، مولانا اس کے لیے بخوشی تیار ہوگئے، اور ''المآثر'' کے نام سے رسالے کا اجراء عمل میں آ گیا، پیش نظر شمارے پر اس رسالے کی زندگی کے ۲۲ر سال پورے ہو جائیں گے۔ مولانا نے اس ذمہ داری کو نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے سنبھالا، اس کا پہلا شمارہ جو محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۱۳ھ کا تھا پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا، اور اس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ برصغیر کے اہل علم سے خراج تحسین وصول کیا، رسالہ اس وقت سے برابر رواں دواں ہے، اور مولانا کا اس سے جو رشتہ تھا وہ بھی اس کے روز اول سے ان کی زندگی کی آخری سانس تک باقی رہا، مولانا کی رحلت سے ادارہ جس صدمہ سے دوچار ہوا ہے اور اس کو جو خلا محسوس ہوا ہے، وہ نہ جانے کب تک محسوس کیا جاتا رہے گا:

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

مولانا ادھر ایک سال سے زیادہ عرصہ سے گردہ کے مرض میں مبتلا تھے، اُس سے کئی سال پہلے ان کے اوپر فالج کا بھی حملہ ہو چکا تھا، اس کے اثرات تو آخر تک نہیں گئے، مگر بہت حد تک اس سے شفا یاب ہو گئے تھے، مگر گردے کی بیماری اندر ہی اندر ان کو کھوکھلا کرتی رہی، اس دوران انھوں نے کئی طرح کا اور کئی جگہ کا علاج کیا، لیکن مرض کا ازالہ نہیں ہوا، اور وقت موعود رفتہ رفتہ قریب آتا رہا، بجائے افاقہ کے مرض شدت اختیار کرتا رہا، ڈاکٹروں نے اس کا آخری علاج غسل کلیہ (**Dialysis**) تجویز کیا، کورس کے مطابق یہ علاج چلتا رہا، اس اثناء میں مولانا کئی بار مئو بھی تشریف لائے، آخری دفعہ گزشتہ

۲۱؍شوال = ۲۹؍اگست کو صبح ۹؍بجے بالکل غیر متوقع اور بغیر کسی پیشگی اطلاع کے مرقاۃ العلوم تشریف لائے، اسی روز ان کو شام میں بنارس اور بنارس سے اگلے روز بمبئ کے لیے روانہ ہونا تھا، مولانا اس دن بہت مضمحل اور کمزور نظر آئے، اس دن دیکھ کر پتہ نہیں کیوں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ چراغ سحری ہو رہے ہیں۔ مگر اپنی روز افزوں علالت کے باوجود اس دن مولانا، حضرت محدث الاعظمیؒ کے ان فتاوی کی زیروکس اپنے ساتھ لے گئے، جو المآثر میں کبھی کبھی شائع ہوتے رہتے تھے، وہ حضرت محدث الاعظمیؒ کی فقہی بصیرت ومہارت اور ژرف نگاہی پر ایک مفصل اور مبسوط مضمون لکھنا چاہتے تھے، اور اسی لیے انھوں نے فرمائش کر کے تمام فتاوی کی زیروکس کروائی تھی، ان فتاویٰ کے علاوہ وہ تصانیف بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، جو حضرتؒ نے فقہی موضوعات پر تحریر فرمائی تھیں، لیکن افسوس کہ ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

اس واقعے کو تقریباً ایک مہینے کا عرصہ گزرا، ۲۲؍ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۹؍ستمبر ۲۰۱۳ء کو شب کے تقریباً ساڑھے دس بجے سرپرست المآثر حضرت مولانا رشید احمد صاحب زید مجدہ نے بذریعہ موبائل اطلاع دی کہ مولانا اعجاز صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے، ان کے اوپر قلب کا شدید دورہ پڑا ہے اور ان کو اسپتال لے جایا جا رہا ہے، اور تقریباً سوا گھنٹے کے بعد پونے بارہ بجے حضرت موصوف ہی کے فون سے یہ خبر خرمن ہوش وحواس پر برق گرا گئی کہ مولانا موت کی آغوش میں چلے گئے ہیں۔ وہ رات بڑی مشکل سے کٹی، آنے والے دن میں یعنی ۲۲؍ذیقعدہ = ۲۹ستمبر یکشنبہ کو بعد نماز ظہر تقریباً سوا تین بجے چھپرا کے ایک کھلے میدان میں ہزاروں مسلمانوں نے آپ کی نماز جنازہ ادا کی، اور وہاں کے مدرسہ ومسجد سے متصل ہی مولانا کی خریدی ہوئی اپنی ایک زمین میں ان کو سپرد خاک کیا گیا۔

اللہ رب العزت مولانا کی مغفرت فرمائے، ان کی قبر کو جنت کا باغ بنائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے، ان کی نیکیوں اور حسنات کو شرف قبولیت سے نوازے، اور لغزشوں سے درگزر فرمائے، آمین ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ سات صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہیں،

صاحبزادگان ماشاءاللہ سب نیک صالح اور عالم ہیں، ان کی سادگی وسعادت مندی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے ان کی نہ صرف تعلیم بلکہ تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی ہے، مدرسۂ چھپرا کے ناظم و بانی مولانا ابراراحمد صاحب مولانا کے خویش اور داماد ہیں، ان سب متاثرین کو راقم ان الفاظ میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہے کہ: **الهمكم الله الصبر، وأعظم لكم الاجر، وغفر لميتكم.**

....

۲۲/ذی قعدہ کا دن راقم سطور کے لیے دوہرے صدمے کا دن تھا، اسی روز ظہر سے پہلے تقریباً گیارہ بجے راقم کی بڑی اماں چندروزہ علالت کے بعد رحلت اختیار کر گئیں، مغرب کی نماز کے بعد ان کی تدفین عمل میں آئی۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جب بارگاہ خداوندی میں دعا کے لیے ان کا ہاتھ اٹھے، تو ان کو بھی شامل فرمالیا کریں۔

خداوند قدوس سے دعا ہے کہ ان مرحومین کا حشر ونشر اپنے ان محبوب بندوں میں فرمائے، جن کے بارے میں اس کا ارشاد ہے کہ:

> ''اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم ان کو جنت کے بالا خانوں میں جگہ دیں گے، جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے۔ جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر توکل کیا کرتے تھے''۔

ضروری اعلان

کاغذ کی ہوشربا گرانی اور کتابت وطباعت کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے رسالہ کی قیمت میں اضافہ ناگزیر معلوم ہو رہا ہے، آئندہ شمارہ سے اس کی قیمت حسب ذیل ہوگی۔

فی شمارہ	=/۲۵ روپئے
سالانہ	=/۱۰۰ روپئے
تین سال کے لیے	=/۲۵۰ روپئے
لائف ممبر شپ	=/۷۰۰۰ روپئے
بیرون ملک	=/۲۵ ڈالر

ماخوذ:از تفسیر عزیزی (مسلسل)

مقدمہ سورۃ التکویر

یہ سورت مکی ہے، اس میں انتیس (۲۹) آیات، ایک سو چار (۱۰۴) کلمات اور پانچ سو چونتیس (۵۳۴) حروف ہیں۔

اس سورت کا مرتبہ ومقام

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی یہ چاہتا ہے کہ قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تو وہ سورۃ "إذا الشمس كورت" پڑھے۔

ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ! بڑھاپے نے آپؐ پر جلدی کی، یعنی آپ کے مزاج مبارک کی قوت سے یہ توقع نہیں تھی کہ ساٹھ کے پیٹے میں ہی آپ پر بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوجائیں گے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ان پانچ سورتوں نے بوڑھا کردیا، سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، سورۂ مرسلات، سورۂ نبا اور سورۂ تکویر۔ ان سورتوں میں دنیا وآخرت میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا ذکر ہے جو امتیوں پر پیغمبروں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے اس سے پہلے آیا اور آئندہ آئے گا، اپنی امت کے غم نے نہایت غلبہ کردیا، اور غم کا خاصہ ہے کہ آدمی کو جلد بوڑھا کردیتا ہے ۔

سألت من الأطباء ذات يوم أخبروني

ما شيبني قال بلغم

فقلت له على غير اختتام

لقد أخطأت فيما قلت بل غمم

یہ بات ذہن میں رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑھاپے سے مراد ضعفِ قویٰ اور بدن کی سستی ہے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ایسے سفید نہیں ہوئے تھے جو دیکھنے والے پر ظاہر ہوں، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص ہیں

فرماتے ہیں: وفات کے دن تک آپ کے سر اور داڑھی مبارک میں صرف بیس بال سفید تھے، ظاہر ہے اتنے سفید بال تو نظر بھی نہیں آتے، نہ عرف میں اتنی سفیدی کو بڑھاپا کہا جاتا ہے۔

سورۂ عبس کے ساتھ ربط کی وجوہ

ربط کی پہلی وجہ:

سورۂ عبس کے شروع میں قرآن کے اوصاف اس طرح مذکور ہیں:

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ یہی مضمون سورۂ تکویر کے آخر میں ترتیب معکوس کے طور پر مذکور ہے، ”اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ“ اور ”اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ“

ربط کی دوسری وجہ:

سورۂ عبس کے آخر میں قیامت کے احوال مذکور ہیں: يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝ اور سورۂ تکویر کی ابتداء میں یہی مضمون شرح وبسط اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورت کی ابتداء میں سورج کے بے نور ہونے کا ذکر ہے اس لیے اس سورت کا نام ”تکویر“ رکھا گیا ہے۔

بارہ حادثاتِ قیامت کا ذکر اور ان میں سورج کے حادثے کا سب سے زیادہ سخت ہونے کی وجہ

اس سورت میں قیامت کے بارہ حادثے ذکر کیے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ سخت سورج کے بے نور ہو جانے کا واقعہ ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جو حادثہ یا مصیبت کسی مقصود بالذات چیز پر واقع ہو وہ زیادہ شدید، ناقابلِ برداشت ہوتا ہے، بہ نسبت اس حادثے کے جو غیر مقصود بالذات چیز پر واقع ہو، مثلاً

جان کا ضائع ہونا، اس پر کسی حادثہ یا مصیبت کا گرنا، مال پر حادثہ پڑنے سے زیادہ تکلیف دہ ہے، اس لیے کہ جان مقصود بالذات ہے اور مال کی ذات مقصود نہیں ہوتی، وہ تو جان کے نفع کے لیے عزیز ہوتا۔

دوسرے یہ کہ جس حادثہ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا حادثہ معارض نہ ہو وہ اس حادثے سے زیادہ شدید ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا اس کے معارض حادثہ بھی موجود ہو، مثلاً اگر جان پر کوئی حادثہ آجاتا ہے جان جانے کا خطرہ ہے، دوسری طرف مال ودولت، جاہ ومنصب حاصل ہونے کی توقع بھی ہے تو آدمی بسا اوقات جان پر بھی کھیل جاتا ہے۔

(ان دو تمہیدی مقدمات کے بعد اب یہ سمجھئے کہ آفتاب کے بے نور ہونے کا حادثہ زیادہ شدید کس طرح ہے) قیامت کے بارہ حادثات جن کا یہاں ذکر ہوا ہے، ان میں سے ہر حادثہ یا تو غیر مقصود بالذات پر واقع ہونے والا ہے، جیسے آسمان کی کھال اتار دینا، یہ حادثہ بھی رونما ہوگا لیکن آسمان دنیا والوں کے لیے بالذات مطلوب نہیں، یعنی براہِ راست اس کی ذات مقصود نہیں ہے، بلکہ اہلِ دنیا کا جو نفع ہے اس کا تعلق ستاروں سے ہے، اور آسمان تو محض صندوق کی طرح ہے، جس میں ہیرے جواہرات اور سامان واسباب رکھا گیا ہو، اگر کبھی صندوق ٹوٹ جائے اور ساز وسامان محفوظ ہو تو کچھ زیادہ ناگواری کی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ حادثہ مقصود بالذات پر واقع نہیں ہوا۔

یا وہ حادثات ایسے ہیں کہ ان کے معارض کوئی حادثہ بھی ساتھ ہے، جو اس حادثہ کی شدت میں کمی کر دیتا ہے، جیسے تسعیرِ جحیم (جہنم کا بھڑکانا) کا حادثہ ہے، مگر اس کے ساتھ اِزلاف جنت کا حادثہ بھی ہے جو فرحت وخوشی کا ذریعہ ہے، یعنی جس طرح جہنم بھڑکائی جائے گی وہاں یہ بھی ہے کہ متقیوں کے لیے جنت قریب لائی جائے گی۔

اسی طرح ستاروں کا بے نور ہو جانا سورج کے بے نور ہو جانے کے مقابلے میں کوئی بڑا حادثہ نہیں، ستارے ڈوبتے اور بے نور ہوتے رہتے ہیں۔

اسی طرح دریائے شور کا بھڑک اٹھنا بھی اس حادثے سے بڑا نہیں کہ دریا شور بھی انسانی ضروریات میں خاص نافع نہیں، لہٰذا یہ بھی مقصود بالذات نہیں۔ پہاڑوں کے اندر زلزلہ برپا ہونا بھی سورج کے حادثے کے مقابلے میں بڑا نہیں، اسی طرح دیگر حادثات بھی اس کے مقابلے میں شدید نہیں ہیں، لیکن ان سب کے مقابلے میں سورج کو بے نور کر دینے کا حادثہ مقصود بالذات پر واقع ہے،

کہ سورج کی روشنی مقصود بالذات ہے، اس سے مخلوق کا نفع براہِ راست متعلق ہے، پھر اس کے معارض کوئی حادثہ بھی نہیں جو فرحت افزا ہو، لہٰذا قیامت کے حادثات میں سے یہ حادثہ سب سے زیادہ سخت وشدید ہے۔

تاریکی کے عجیب فوائد

آفتاب کے بے نور کردینے میں نفسِ انسانی کے وجدانی حالات کھولنے کے نہایت ہی عمدہ اسباب موجود ہیں، سورج کی روشنی وچمک کی مدد سے آنکھوں کے ذریعہ تو بہت سی چیزیں نظر آتی ہیں، مگر یہی روشنی معقولات وجدانیات کے لیے حجاب بن جاتی ہے (فکر وخیال کے دریچے اس وقت کھلتے ہیں جب ظاہری آنکھیں کچھ نہ دیکھ رہی ہوں) یہی وجہ ہے کہ عقلی چیزوں میں غور وفکر کے لیے بہترین وقت رات کا ہے، خواب کے لیے بھی یہی وقت مقرر ہے۔ عاشقوں، مریضوں، دردمندوں اور مصیبت زدوں کو جو کیفیات نفسانی پیش آتی ہیں ان کیفیات کا بھی یہی وقت ہے۔ اسی طرح اہل مراقبہ وتوجہ بھی اپنی نسبتِ باطنی کو اسی وقت بڑھاتے ہیں۔ ساحر وجادوگر، اور نفسیاتی تاثیرات کا عمل کرنے والے لوگ بھی رات کو ہی اپنے کام میں مشغول ہوتے ہیں۔

ان بارہ واقعات کے یہاں ذکر کرنے کی حکمت

ان بارہ حادثوں کو یہاں کیوں ذکر کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب نفس انسانی کی توجہ اپنے تمام مالوفات ومضرات (جو چیزیں انسان کی طبیعت ونفس کو پسندیدہ وناپسند ومضر ہیں) سے کلی طور پر منقطع ہوجائے گی، انسان کا فہم وشعور ارواحِ سماویہ کی مدد سے بہت وسیع وکشادہ ہوجائے گا، اعمال اپنی اپنی مثالی صورتوں میں ظاہر ہوں گے، اور ہر اچھے برے عمل کی جزا کھل کر سامنے آجائے گی، جس کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے **"عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ"**

ان بارہ حادثوں میں سے ہر حادثہ کا اس انقطاع میں دخل ہے، اب اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح یہ حادثات انسان کے نفس کی توجہ کے انقطاع کا ذریعہ ہوں گے، سب سے پہلے سورج وستاروں کے بے نور ہوجانے والے حادثہ کو لیجئے، جب سورج وستارے تاریک وبے نور

ہوجائیں گےتو انسان کےنفس کا آسمان کے ساتھ اپنی حوائج وضروریات کی وجہ سے جوتعلق ہے وہ منقطع ہوجائے گا، اس لیے کہ آسمان سے جونفع کاتعلق تھا وہ انہیں کی وجہ سے تھا، مثلاً روشنی کی وجہ سے انسان چیزیں دیکھتا تھا، موسم وفصلیں بھی سورج ستاروں کی وجہ سے بدلتی تھیں، چاند کے بدلنے سے مہینوں کی ابتداوانتہاء ہوتی تھی اورانہیں اجرامِ فلکی کی وجہ سے آنے والے حادثات کی خبر پہلے سے معلوم کی جاتی تھی، جب یہ وسائل ہی ختم ہوگئےتو اب نفع کی توقع بھی نہیں رہی، اس انقلاب کی وجہ سے اس پسندیدہ مانوس جہاں کی چھت بھی خراب ہوجائے گی، اس حادثہ سے نفس کا تعلق آسمان سے منقطع ہوجائے گا، پہاڑوں کے چلانے اورزمین میں زلزلہ برپا کردینے کی وجہ سے اس زمین کے ساتھ مسکن ہونے کی وجہ سے جوطبعی محبت تھی وہ ختم ہوجائے گی، اب زمین سے خزانوں کے دریافت ہونے، کھیتی میووں کے اُگنے، اورچشموں ونہروں کے بہنے کی امید ٹوٹ جائے گی، اوراس گھر کا صحن برباد ہوکررہ جائے گا۔

(لہٰذاانسان کے نفس کو جوتعلق تھااس جہاں سے وہ مزید کمزور بلکہ ختم ہوتا جائے گا)

گابھن جانوروں کے حمل گرجانے ومعطل ہوجانے کی وجہ سے انسان کے نفس کو اس جنس سے جوطبعی اُنس اوراس سے حاصل ہونے والے فوائد مثلاً دودھ، پشم، گھی وغیرہ کی وجہ سے جوتعلق ہے وہ ختم ہوجائے گا، اس انقلاب کی وجہ سے گویا اس گھر کا مطبخ وخزانہ برباد ہوجائے گا۔

وحوش کے جمع ہوجانے کی وجہ سے انسان کے نفس کو شکار کی طرف جو میلان ہے، اوران شکاری جانوروں سے حاصل ہونے والے فوائد مثلاً صوف وپشم، مشک نافہ وغیرہ کی وجہ سے ان جانوروں کو پکڑنے، ان کو مسخر کرنے کی جو ہمت وشوق تھا وہ ختم ہوجائے گا۔

دریاؤں کے جوش مارنے والے حادثے کی وجہ سے، بحری سفر، سمندر سے موتی وعقیق اورعنبر حاصل ہونے کی امید ختم ہوجائے گی۔

یہ چھ حادثے اس عالم دنیا اورانسان کے جسم سے متعلق تھے، اس کے بعد باقی کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے، چنانچہ جب نیک نفس اپنے ہم جنس نیک نفسوں سے ملیں گے، اورشریر نفس اپنے ہم جنس شریر نفسوں سے ملیں گے، اس سے ہرایک کی کیفیاتِ نفسانیہ دوسرے کے قلب پر منعکس ہوں گی، جس سے ہر شخص پر اپنی وجدانیات (دل کی باتیں) کماحقہ ظاہر ہوجائیں گی، اجمالی طور پر اس کو یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ وہ اہلِ خیر میں سے ہے یا اہلِ شر میں سے۔

موءودہ، یعنی وہ بچی جسے زندہ گاڑ دیا گیا تھا اس سے سوال کیے جانے کے واقعہ سے انسان پر یہ بات واضح ہوگی کہ انسانی فہم وشعور نے اس عالم میں نہایت ہی ترقی کرلی ہے، اس میں عظیم وسعت پیدا ہوگئی ہے، اس لیے کہ یہ موءودہ دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئی تھی کہ اس کا نفس بالکل سادہ اور فہم وشعور کی وسعتوں سے خالی تھا، آج جب یہ بھی سوال وجواب کے قابل ہورہی ہے تو معلوم ہوا کہ انسانی شعور میں عظیم الشان وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

اسی واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ جس نے بھی کسی کا حق تلف کیا ہے، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، خواہ جس کے حقوق تلف کیے ہیں اس کے ساتھ کتنا ہی قریبی تعلق کیوں نہ ہو، مثلاً باپ بیٹا ہونے کا تعلق ہی ہو، لیکن حق تلفی کی جواب دہی سے کوئی نہ بچ سکے گا۔

صحیفوں کے کھولے جانے سے انسان اپنے اقوال واعمال کی تفصیل معلوم کرلے گا۔

آسمان کی پوست وکھال اتارنا کنایہ ہے عالم مثال کی تجلی سے، عالم مثال کا مرکز ومعدن افلاک کی قوتِ خیالیہ ہے، سوآسمان کی پوست اتر جانے سے انسان اپنے اعمال کی مثالی صورتیں دیکھے گا، اور اس پر حقیقت حال کھل جائے گی۔ ع

کہ با کے باختہ ام عشق در شب دیجور

اپنے اعمال کے موافق دوزخ کے بھڑکائے جانے، جنت کے قریب لانے، اس کی آرائش وسجاوٹ کے واقعہ سے اس پر اپنے اعمال پھر اپنے انجام کے اعتبار سے تمام صورت حال کھل کر سامنے آجائے گی، چونکہ یہ سب کچھ اس کے اعمال کا کیا دھرا ہی ہے اور اسی کی صورتِ مثالی ہے، اس وقت اس آیت کا مضمون اس کے سامنے جلوہ گر ہوگا، "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ"

یہ چھ انقلاب وحوادث عالم آخرت اور انسان کے قوائے عقلیہ وخیالیہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس تقریر سے اس ترتیب کی رعایت کی وجہ بھی ظاہر ہوگئی۔

عالم برزخ کے متعلق فائدہ

اوپر کی تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ عالم برزخ میں انسان کا نفس اگرچہ بدن سے جدا رہتا ہے، لیکن اس کو اپنے اعمال کے تمام احوال پر اطلاع ممکن نہیں ہے، کیونکہ زمین وآسمان ابھی تک

قائم ہیں، اس کو اپنے سابقہ مکانات کے ساتھ تعلق، پسندیدہ چیزوں کی طرف رغبت، اپنے اقرباء کے حال کی طرف توجہ، اور گذرے ہوئے حالات کی یاد ابھی تک کچھ باقی ہے، ابھی تک نفسِ انسانی خالص طور پر اور کامل درجے میں عالَم غیب میں نہیں پہنچا، اس لیے اس کو عالم برزخ کہتے ہیں کہ کسی درجے میں اس کا تعلق دنیا کے ساتھ ہے اور کسی درجے میں اس کا تعلق عالم آخرت کے ساتھ بھی ہے، درمیان درمیان ہے، دنیا وآخرت کی درمیانی حالت ہے، برزخ کا معنی درمیان کی آڑ ہوتا ہے۔

عالم برزخ کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی آدمی بہت عرصہ تک ایک شہر یا ملک میں رہا پھر کسی دوسرے شہر میں چلا گیا، مگر اس کا ایک گھر ابھی تک سابقہ شہر میں بھی ہے، رشتہ دار بھی ہیں، خط وکتابت اور آمدورفت بھی جاری رہتی ہے، ایسی صورت میں اس آدمی کا تعلق سابقہ شہر سے مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔

الحمد لله تمت مقدمة سورة التكوير.

☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۲۵ کا بقیہ

ثانیاً: – حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں: ہفتم آنکہ مضمون احادیث در خطب خود ارشاد فرمایند تا اصل احادیث بآں موقوف خلیفہ قوت یابد انیکہ بغور سخن نمیر سند در بند آنکہ در متفق علیہ از حضرت صدیق صحیح نشد مگر شش حدیث واز فاروق اعظم بہ صحت نرسید مگر ہفتاد حدیث ایں را نمی فہمند ونمی دانند کہ حضرت فاروق تمام علم حدیث را اجمالاً تقویت دادہ واعلان نمودہ۔

اس بیان سے ظاہر ہوگیا کہ حضرت فاروق اپنے خطبوں میں احادیث کا مضمون بیان کرتے تھے پس جو لوگ اصل حقیقت سے بے خبر ہیں انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ انھوں نے حدیث بیان نہیں کی حالانکہ انھوں نے حدیث ہی بیان کی ہے، فقط قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہا ہے۔

الازہار المربوعہ

باب دوم

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

اب رہا آپ کا یہ فرمانا کہ یہاں ابن عباس کا فتویٰ اس حدیث کے خلاف ہے، اور اسی وجہ سے امام احمد نے اس حدیث کو چھوڑا ہے، اور فتوے کا حدیث کے مخالف ہونا حدیث کے شذوذ کو مقتضی نہیں ہے جیسا کہ آپ کی ایک طویل عبارت سے ثابت ہوتا ہے۔ تو اس پر یہ گفتگو ہے کہ (۱) پھر امام بیہقی نے شذوذ کا دعویٰ کیوں کیا؟ کیا ان کو معلوم نہیں تھا کہ فتوے کے خلاف ہونے سے حدیث شاذ نہیں ہوسکتی؟ کیا اصول حدیث کو آپ ان سے بہتر جانتے ہیں؟

(نوٹ) یہ یاد رہنا چاہئے کہ مجیب صاحب نے بیہقی کے دعوائے شذوذ کو فتح الباری سے آثار ص۲۲ میں نقل کیا ہے۔

(۲) ابن القیم نے تصریح کی ہے کہ امام احمد کے اصول میں سے ایک اصل یہ ہے کہ جب راوی اپنی روایت کے خلاف فتوی دے تو اس کی روایت واجب العمل ہوگی، نہ کہ اس کا فتویٰ، پس بتایا جائے کہ یہاں امام احمد نے اپنی اصل کے خلاف کیوں کیا؟ کیا امام احمد کو معلوم نہ تھا کہ اپنی حدیث کے خلاف کسی صحابی کا فتویٰ دینا حدیث کی صحت میں قادح یا اس کے لیے موجب شذوذ نہیں ہے؟

اگر مجیب صاحب اپنی بات کی پچ اور مذہبی تعصب سے الگ ہوکر اور ابن القیم وشوکانی کی تقلید جامد سے دست بردار ہوکر غور کریں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ تین باتوں میں سے ایک ضرور ہے:

۱:- یا تو امام احمد وغیرہ حدیث طاؤس کو حدیث مرفوع نہیں مانتے، بلکہ اس کو حضرت ابن عباس کے موقوفات میں سے شمار کرتے ہیں، جیسا کہ ابن حزم نے محلی ج۱۰ ص۱۶۸ میں لکھا ہے کہ **أما حديث طاؤس فليس شيئ أنه عليه الصلوٰة والسلام هو الذى جعلها واحدة أو ردها إلى الواحدة ولا أنه عليه السلام علم ذلک فاقره.** یعنی حدیث طاؤس کے کسی طریق میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا یا ایک کی طرف لوٹایا اور نہ

یہ مذکور ہے کہ آپ نے تین کے ایک کرنے کو جانا اور برقرار رکھا۔ پس جب حدیث طاؤس بھی موقوف ٹھہری تو یہ کہنا غلط ہو گیا کہ ابن عباس کی حدیث ان کے فتوے کے خلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ ابن عباس کا موقوف ان کے دوسرے موقوفات کے خلاف ہے۔

ناظرین اس بات کو یاد رکھیں کہ حدیث طاؤس کو موقوف کہنا کسی مقلد کا قول نہیں ہے، بلکہ تقلید کے جانی دشمن ابن حزم کا قول ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ مجیب صاحب ابن حزم کی نسبت کیا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ ابن حزم کی تردید کرنے کے لیے وہ کسی مقلد کی کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں یا کسی غیر مقلد کی۔

۲:- یا پھر امام احمد وغیرہ حضرت ابن عباس کے فتووں کو حدیث طاؤس سے زیادہ صحیح وقوی حدیث پر مبنی سمجھ کر ان فتووں کو مرفوع کا حکم دیتے ہیں۔

۳:- اور تیسری صورت یہ ہے کہ امام احمد وغیرہ نے یہ دیکھا کہ سات آٹھ ثقہ اشخاص تو یہ ذکر کرتے ہیں کہ ثلاث مجموع کا تذکرہ آنے پر ابن عباسؓ نے تینوں کے واقع ہونے کا فتویٰ دیا۔ اور ایک طاؤس یہ ذکر کرتے ہیں کہ ابن عباس نے ثلاث مجموع کے تذکرہ پر یہ فرمایا کہ عہد نبوی وعہد صدیقی اور ابتدا خلافت فاروقی میں تین ایک ہوتی تھی۔

ظاہر ہے کہ ایک ہی باب میں حضرت ابن عباسؓ ایسے مختلف جواب جن میں تطبیق کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی کیونکر دے سکتے ہیں، اس لیے امام احمد وغیرہ نے یہ فرمایا کہ چونکہ پہلے جواب کو ابن عباسؓ کے متعدد ثقہ شاگرد روایت کرتے ہیں، اور دوسرے جواب میں طاؤس متفرد ہیں، لہذا پہلا جواب راجح ومقبول ہے اور دوسرا شاذ ومردود ہے۔ اور اس فیصلہ کی ابن المنذر نے اس طرح تائید کی ہے کہ اگر طاؤس کا ذکر کیا ہوا جواب صحیح ہو تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یاد رکھتے ہوئے اس کے خلاف فتویٰ دیا، اور حضرت ابن عباسؓ کی نسبت اس کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایسا کریں گے۔ اس لیے متعدد ثقہ اشخاص کے بیان کو ایک شخص کے بیان کے مقابلہ میں ترجیح دینا متعین ہے۔

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ چونکہ ایک مسئلہ میں چند ثقات حضرت ابن عباسؓ کا جواب کچھ روایت کرتے ہیں اور ایک ثقہ ان کے خلاف روایت کرتا ہے اور مجیب صاحب لکھ چکے ہیں کہ **اذا خالف الثقة غيره من الثقات فهو شاذ.** یعنی جب ایک ثقہ اپنے غیر کی ثقات میں سے مخالفت

کرے تو مخالف کی روایت شاذ ہے۔ لہٰذا حدیث طاؤس خود مجیب صاحب کی نقل کی ہوئی تعریف کی بنا پر شاذ ٹھہری، اوران کا یہ کہنا کہ اس پر شاذ کی تعریف صادق نہیں آتی، غلط ہوگیا۔

اوراس تقریر سے شوکانی وابن القیم کے جوابوں پر تنقید بھی ہوگئی۔ اب مجیب صاحب میں جرأت ہوتو اس کا جواب دیں تاکہ ان کی ''طباعی'' کی داد دی جاسکے۔

چونکہ مجیب صاحب کی تیسری وجہ کا جواب بھی ہوگیا اس لیے ان کی چوتھی وجہ کو سنیے۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''رابعاً اگر مولف کی خاطر سے بفرض محال یہ مان لیا جائے کہ امام احمد نے اس حدیث کو شاذ کہا اور منکر کہا تو یہ صحت میں قادح نہیں ہے.................. امام احمد اور محدثین کی ایک جماعت منکر کا اطلاق ایسی حدیث فرد پر کرتی ہے جس کی متابعت کوئی حدیث نہ کرتی ہو'' (اھ باختصار)

جواب: — مجیب صاحب ہوش کی دوا کیجئے، آپ کو نقل اتارنے کا بڑا اشواق ہے، لیکن سلیقہ ندارد۔ حضرت من! آپ کا یہ جواب تو اس وقت قابل سماعت تھا جب امام احمد نے منکر کا لفظ استعمال کیا ہوتا۔ لیکن جب ایسا نہیں ہے، بلکہ امام احمد نے صاف لفظوں میں روایت طاؤس کو ابن عباسؓ کی دوسری روایتوں کی مخالف فرمایا ہے، تو یہ جواب دینا سخت نافہمی ہے، غور کیجئے کہ امام احمد تو صاف صاف مخالفت کا ذکر کریں اور آپ کہیں کہ امام احمد نے تفرد کا اعتراض کیا ہے، یہ توجیہ **القول بمالا یرضی بہ قائلہ** ہے یا نہیں؟ سخت تعجب ہے کہ آپ اعلام الموقعین سے امام احمد کا یہ قول **بروایۃ الناس عن ابن عباس من وجوہ خلافہ** (ترجمہ گذر چکا) نقل کرنے کے بعد بھی تفرد والی توجیہ کا ذکر کرکے اپنی غفلت ونافہمی کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔

اوراسی غفلت ونافہمی کا اظہار آپ اپنے اس قول میں بھی کرتے ہیں کہ ''امام بیہقی نے بھی اسی معنی میں شاذ کا اطلاق کیا ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر کی پوری عبارت سے صاف ظاہر ہے'' (آثار ص۲۲) اس لیے کہ میں امام بیہقی کے قول سے ثابت کر چکا ہوں کہ وہ حدیث طاؤس کو ابن عباسؓ سے دوسری روایات کے مخالف قرار دیتے ہیں۔ اوراس کو مخالف قرار دینا خود اس عبارت سے بھی ثابت ہوتا ہے جس کو آپ نے ابن حجر کے حوالہ سے نقل کیا ہے، چنانچہ آپ اس عبارت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ''اولاً بیہقی نے ابن عباس کے فتوئ کو متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے پھر ابن منذر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابن عباس کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث یاد رکھیں

اور پھر اس کے خلاف فتویٰ دیں'' (آثار ص۲۲) اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ بیہقی حدیث طاؤس کو ابن عباسؓ کے فتویٰ یا بلفظ دیگر ابن عباس سے دوسری روایتوں کے خلاف قرار دیتے ہیں اور اس کو ابن حجر نے بیہقی کا دعویٰ شذوذ کہا ہے، چنانچہ اس سے پہلے ابن حجر کی عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے آپ خود لکھتے ہیں کہ ''حدیث طاؤس کے مخالفین کا دوسرا اعتراض شذوذ کا دعویٰ ہے اور اس کو بیہقی نے پسند کیا ہے'' (آثار ص۲۲) پس نہ معلوم آپ نے کس عالم میں بے سمجھے بوجھے یہ لکھ دیا کہ بیہقی نے بھی اسی معنی (یعنی تفرد کے معنی) میں شذوذ کا اطلاق کیا ہے۔ باقی رہا آپ کا فتویٰ اور روایت میں فرق کرنا تو اس کی حقیقت او پر منکشف ہو چکی ہے، بہر حال آپ کا یہ کہنا کہ بیہقی نے شذوذ کا اطلاق تفرد کے معنی میں کیا ہے صریح غلط بیانی ہے۔

آگے آپ نے یہ جو فرمایا کہ ''امام بیہقی کو اس حدیث کی صحت پر اعتراض نہیں ہے'' (انتہی بمعناہ) تو اس کا جواب یہ ہے اگر بیہقی کو اس کی صحت پر اعتراض نہیں ہے اور آپ کا اختراعی شذوذ صحت کے منافی نہیں ہے، تو بیہقی نے اس کو بخاری کے ترکِ حدیثِ طاؤس کی علت کس طرح قرار دے دیا۔ زاد المعاد سے جو عبارت ہم نے نقل کی ہے اس کو پھر پڑھئے، اور اگر بالفرض بیہقی کو اس کی صحت پر اعتراض نہیں ہے تو اس کے قابل عمل ہونے پر تو ضرور اعتراض ہے، اور ہمارے لیے بس۔ فرض کر لیجئے کہ حدیث طاؤس صحیح ہو لیکن قابل عمل نہ ہو تو آپ کو کیا فائدہ اور ہم کو کیا نقصان؟ اصل یہ ہے کہ آپ اس اصول سے قطعاً نا آشنا ہیں کہ بعض حدیثیں اصولی تعریف کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہیں، لیکن قابل عمل نہیں ہوتیں جیسا کہ حافظ ابن حجر کے حوالہ سے سیوطی نے تدریب الراوی میں لکھا ہے۔

مجیب صاحب نے بڑے شد و مد سے لکھا ہے کہ ''اگر بیہقی کو اس حدیث کی صحت پر اعتراض ہے تو ان کی کوئی تصریح اس بارہ میں پیش کریں''، لیکن میرا چیلنج یہ ہے کہ اگر بیہقی کو اس حدیث کی صحت پر اعتراض نہیں ہے، تو زاد المعاد سے جو الفاظ بیہقی کے میں نے نقل کیے اس کی کوئی مراد بیان کریں۔

یہ بحث تو ختم ہوگئی، لیکن مجیب صاحب کے لطائف ابھی ختم نہیں ہوئے۔ اب ناظرین ذرا مجیب صاحب کے علمی و ادبی لطائف ملاحظہ فرمائیں۔

ا:- مجیب صاحب نے ص۲۱ میں مولانا عبدالحی کے حوالہ سے فتح الباری کی ایک عبارت نقل کی ہے، جس کا آخر فقرہ قد احتج به الجماعة ہے، اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ایسی حدیث کو

تمام محدثین نے قابل احتجاج قرار دیا ہے، حالانکہ یہ ترجمہ حد درجہ غلط ہے، جس نے مقدمہ فتح الباری میں متکلم فیہ رواۃ والی فصل کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، وہ جانتا ہے کہ ہر راوی کے حال کے آخر میں حافظ اس قسم کے الفاظ لکھا کرتے ہیں، اوران الفاظ سے ان کو جتانا منظور ہوتا ہے کہ اس راوی سے اصحاب صحاح میں سے فلاں فلاں نے احتجاج کیا ہے۔ پس **قد احتج به الجماعة** کی صحیح مراد یہ ہے کہ اس راوی سے جماعت اصحاب ستہ نے حجت پکڑی، یعنی بہ کی ضمیر راوی کی طرف راجع ہے اور جماعۃ سے مراد کل اصحاب صحاح ستہ ہیں۔

۲:-اسی صفحہ میں مولانا موصوف کی ایک اور عبارت نقل کی ہے جس میں **کثیراً ما** کا لفظ موجود ہے، لیکن مجیب صاحب ترجمہ میں اس لفظ کو کھا گئے ہیں۔

۳:-ص۲۲ میں فتح الباری کی عبارت **الجواب الثاني دعوى شذوذ رواية طاؤس وهي طريقة البيهقي** کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں کہ حدیث طاؤس کے مخالفین کا دوسرا اعتراض شذوذ کا دعویٰ ہے اور اس کو بیہقی نے پسند کیا ہے۔ یعنی جواب کے معنی اعتراض اور طریقہ کے معنی پسند کیا ہوا۔

۴:-اس سے پہلی بحث میں **كما أشار إليه العيني** کا ترجمہ یہ فرما چکے ہیں کہ ایسا ہی کہا عینی نے یعنی أشار کے معنی کہا۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

''ثانیاً:-علامہ ابن العربی مالکی شارح ترمذی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی صحت میں کلام ہے پس وہ اجماع پر کیسے ترجیح پا سکتی ہے'' (دیکھو فتح الباری ج۹ ص۲۹۱)

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''ابن العربی نے یہ نہیں بیان کیا کہ وہ کون حضرات ہیں جن کو اس حدیث کی صحت میں اعتراض ہے، اور وہ کون سی وجہ ہے جس کی وجہ سے یہ حدیث صحیح نہیں'' الخ

جواب:-ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ علامہ ابن العربی کا مذکورہ بالا قول چونکہ مجیب صاحب کے خلاف ہے، اس لیے جب تک ابن العربی یہ نہ بتائیں کہ کن حضرات کو اس حدیث کی صحت میں اعتراض ہے اور وجہ اعتراض کیا ہے، اس وقت تک وہ ابن العربی کا قول ماننے کے لیے تیار

نہیں ہیں، لیکن جب بیہقی نے شعیب بن زریق کی نسبت تکلموا فیہ (یعنی لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے) کہا اور مجیب صاحب نے اس کو اپنی خواہش کے مطابق پایا، تو بیہقی سے دریافت کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کن حضرات نے کلام کیا ہے، اور وجہ کلام کیا ہے؟ اسی پر منحصر نہیں، آثار میں اس طرح کی اور بھی مثالیں موجود ہیں۔ بہر حال مجیب صاحب کی یہ چال بھی ان کے حق میں کچھ مفید نہیں ہے، دنیا جانتی ہے کہ امام احمد، بیہقی اور ابن عبدالبر وغیرہم نے اس حدیث کی صحت میں کلام کیا ہے، ان حضرات کے اہل ہونے میں تو مجیب صاحب کو کلام نہیں ہوسکتا۔ باقی وجہ کلام میں جو گہر افشانیاں انھوں نے کی ہیں، ان کی حقیقت واشگاف ہوچکی ہے، اس سے مجیب صاحب نے اپنی غیر مقلدیت کا ایک نمونہ بھی پیش کیا ہے لکھتے ہیں:

''وأما الإجماع الذی أشار إلیہ ابن العربی فما ہو إلا ہوس من ہوسات المقلدین (وہ اجماع جس کی طرف ابن العربی نے اشارہ کیا ہے وہ مقلدین کی ایک ہوس کے سوا کچھ نہیں ہے)''

ناظرین! اس دریدہ دہنی کو ملاحظہ کریں کہ جس اجماع کو ابوالولید باجی، ابن حجر، ابن العربی، ابن القیم اور ابن تیمیہ کے دادا ابوالبرکات رحمہم اللہ بیان کرتے ہیں اس کو مقلدین کی ''ہوس'' کہا جاتا ہے، لیکن بخاری کی صحت پر محدثین کے اجماع کا بار بار ذکر کرنے کے وقت دل میں یہ خطرہ نہیں گذرتا کہ کہیں اس اجماع کا تخیل غیر مقلدین کی ہوس خام کا نتیجہ تو نہیں ہے، اس لیے کہ جو اعتراضات مجیب صاحب کو پہلے اجماع میں ہیں، وہی بلکہ اس سے زیادہ اعتراضات دوسرے اجماع پر بھی ہیں اور ہوسکتے ہیں۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

رابعاً: –امام شافعی ونووی وغیرہما نے فرمایا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے (فتح الباری ص۲۹۱)

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''یہ غلط ہے کہ امام نووی نسخ کے قائل ہیں...... ہاں امام شافعی کے متعلق فتح الباری میں یہ عبارت موجود ہے (اس کے بعد عبارت نقل کر کے اس کا حسب ذیل ترجمہ کرتے ہیں) بیہقی نے امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس کو اس حدیث کے ناسخ کا علم ہوگیا تھا...... خیال فرمائیے امام شافعی کے دعوائے نسخ کی وجہ صرف ایک خیالی ناسخ ہے، جس کا وجود آج تک دنیائے اسلام کی آنکھوں سے اوجھل

ہے''۔(آثار ص ۲۵،۲۶)

جواب:- میں نے نووی کو نسخ کا قائل نہیں لکھا ہے، لہٰذا آپ کا یہ مطالبہ بے معنی ہے کہ فتح الباری کی کوئی صریح عبارت پیش کرو جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ امام نووی منسوخ ہونے کے قائل ہیں؟ میں نے تو ''فرمانے'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو حکایت قول غیر اور ذاتی تحقیق کے بیان دونوں کو عام ہے۔ اب آپ ہی کہئے کہ کیا ابن حجر نے فتح الباری ج ۹ ص ۲۹۱ میں امام نووی کی حکایت نسخ کا ذکر نہیں کیا ہے، اور کیا مازری کا کلام جو نووی نے نقل کیا ہے اس میں مازری نے یہ تسلیم نہیں کیا ہے کہ صحابہ کا اجماع ناسخ کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے اور نووی نے اس کو نقل کر کے سکوت نہیں کیا ہے، اور کیا ابن حجر نے دعوائے نسخ کی یہی مراد نہیں بتائی ہے؟ اچھا اس کو جانے دیجئے اور یہ سنئے کہ نووی جس مجتہد کی تقلید کرتے ہیں یعنی امام شافعی وہ تو منسوخ ہونے کے قائل نہیں، پھر نووی اپنے امام کے قول سے کیسے روگردانی کر سکتے ہیں؟ جب امام شافعی اس حکم کو منسوخ مانتے ہیں تو ایک نووی ہی کیا امام شافعی کا ہر مقلد اس حکم کو منسوخ ماننے والا کہا جائے گا۔

باقی رہا آپ کا یہ کہنا کہ ''امام شافعی نے صرف ایک خیالی ناسخ کی بنا پر نسخ کا دعویٰ کیا ہے'' تو مہربان من! پہلے آپ علم سے کچھ مناسبت پیدا کیجئے اس کے بعد امام شافعی کے منھ آنے کا حوصلہ کیجئے گا۔ یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ امام شافعی کے دعوائے نسخ کی وجہ صرف ایک خیالی ناسخ ہے، لیکن اس کو خیالی ثابت کرنا کارے دارد۔ یہی وجہ ہے کہ امام موصوف نے نسخ کی جو تقریر کی ہے اس کے کسی جزء کا جواب دینے کی آپ نے ہمت نہیں کی اور نہ ان شاء اللہ آئندہ کر سکتے۔ سنئے! امام موصوف کا قول ابن القیم نے ذرا تفصیل کے ساتھ اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں: **فالذی یشبه أن یکون ابن عباس قد علم شیئاً فنسخ، فان قیل فما دل علی ما وصفت، قیل لا یشبه أن یکون ابن عباس قد یروی عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم شیئاً ثم یخالفه بشئ لم یعلمه کان من النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فیه خلاف، فان قیل فلعل هذا شئ روی عن عمر فقال فیه ابن عباس بقول عمر، قیل قد علمنا ان ابن عباس یخالف عمر فی نکاح المتعة وبیع الدینار بالدینارین وبیع امهات الاولاد فکیف یوافقه فی شئ روی عن النبی صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم خلافه** (ص ۲۷) یعنی قرین صواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس نے ایک بات جانی (یعنی تین کا ایک ہونا) پھر وہ منسوخ ہوگئی۔ اگر کہا جائے کہ

آپ نے جو بیان کیا اس پر کیا دلیل ہے؟ تو کہا جائے گا کہ یہ بات قرین صواب نہیں معلوم ہوتی کہ ابن عباس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات جان کر پھر اس کی مخالفت کریں؛ باوجودیکہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف معلوم نہ ہو۔ پھر اگر کہا جائے کہ شاید یہ چیز حضرت عمرؓ سے مروی ہو اور حضرت ابن عباسؓ بھی حضرت عمر کے قول کے قائل ہو گئے ہوں تو کہا جائے گا کہ ہم کو معلوم ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نکاح متعہ اور ایک دینار کو دو کے بدلے بیچنے اور بیع ام ولد کے مسائل میں حضرت عمر کی مخالفت کرتے ہیں۔ پس حضرت عمر کی اس بات میں موافقت کیونکر کر سکتے ہیں، جس کے خلاف انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

امام شافعی کی اس تقریر کو سامنے رکھئے اس کے بعد اپنی شوخ کلامیوں اور خیال آرائیوں کا جواب سنیے! آپ فرماتے ہیں: ''یہ عجیب بات ہے کہ حضرت ابن عباس کو ناسخ کا علم ہو گیا تھا لیکن وقوع ثلاث کے نفاذ کی نسبت حضرت عمر ہی کی طرف کرتے ہیں''۔ میں کہتا ہوں نہ معلوم مجیب صاحب کی کیسی سمجھ ہے، آخر حضرت عمرؓ کی طرف وقوع ثلاث کے نفاذ کی نسبت کرنے سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کو ناسخ کا علم نہیں تھا؟ یا یہ کہ اگر ان کو ناسخ کا علم ہوتا تو وقوع ثلاث کے نفاذ کی نسبت وہ حضرت عمرؓ کی طرف نہ کرتے، ان دونوں باتوں میں کیا لزوم ہے؟

مجیب صاحب دیکھیں کہ حضرت جابرؓ صحیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ ہم نے عہد نبوی اور عہد صدیقی میں متعہ کیا تا آنکہ حضرت عمرؓ نے منع کر دیا، یعنی تحریم متعہ کی نسبت حضرت جابرؓ حضرت عمرؓ کی طرف کرتے ہیں، حالانکہ مجیب خود آثار ص ۱۱۸ میں حضرت جابر کی نسبت تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی متعہ کا منسوخ ہونا سن چکے تھے اور جانتے تھے، پس جو جواب وہاں دیں اسی کو یہاں بھی جاری کریں۔

نیز اگر ابن عباس کو ناسخ کا علم نہ ہوتا تو حضرت عمر کے فعل سے اظہار رضامندی کرتے یا بدرجہ اقل ان کے موافق فتویٰ نہ دیتے، باقی رہا یہ شبہہ کہ پھر ابن عباس نے اس ناسخ کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس یا کوئی صحابی حضرت عمر کو معاذ اللہ مبتدع نہیں سمجھتے ہیں اور جن لوگوں کے سامنے یہ ذکر ہو رہا تھا ان کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ حضرت عمر حکم نبوی کے خلاف کوئی بات کریں گے، اس لیے نہ حضرت ابن عباس ہی نے ناسخ کی تصریح کی حاجت سمجھی، نہ سننے

والوں نے اس کو دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

اور آپ یہ جو فرماتے ہیں کہ ''حضرت عمر نے حکم سنانے کے وقت اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور باوجود موقع بیان ہونے کے رازداری سے کام لیا۔ لطف تو یہ ہے کہ کتمان علم کی وعید کے مستوجب ہونے کو قبول فرمایا لیکن کسی طرح ناسخ کو بتلانا گوارا نہ فرمایا''

تو حضرت من! پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کتمان علم کا معنی اور اس کی وعید کی صحیح مراد بھی جانتے ہیں یا صرف حضرت فاروق اعظم کو مستوجب وعید ہی بتانے کا شوق ہے (معاذ اللہ)

اگر کتمان علم کا یہی مطلب ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں تو (معاذ اللہ) آپ کو ہر صحابی کو مورد الزام قرار دینا پڑے گا، اس لیے کہ حضرت ابو ہریرہؓ جو صحابہ میں سب سے زیادہ حدیث بیان کرنے والے ہیں، ان کا بھی یہ قول ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث کے دو ظرف محفوظ کیے ہیں جن میں سے ایک ظرف کی حدیثیں تو بیان کرتا ہوں اور دوسری کی حدیثیں اگر بیان کروں تو میری یہ حلق کاٹ ڈالی جائے گی (بخاری) پس جب حضرت ابو ہریرہؓ نے ساری حدیثیں بیان نہیں کیں تو دوسرے کسی صحابی کے متعلق کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ساری حدیثیں بیان کی ہوں گی، لہٰذا آپ کے قول سے لازم آئے گا کہ معاذ اللہ تمام صحابہ کتمان علم کے مرتکب ہوئے، بالخصوص خلفائے اربعہ کہ صحابہ میں یہ حضرات قلیل الحدیث ہیں۔

میں حیران ہوں کہ آپ کو کون کون سی بات پڑھاؤں، خیر سنئے! کتمان علم جس پر وعید آئی ہے اس سے یہ مراد ہے کہ پوچھنے پر نہ بتائے باوجودیکہ اس کو معلوم ہو۔ یا جانتا ہو کہ میرے سوا اس علم کو کوئی دوسرا نہیں جانتا پھر بھی نہ بتائے، اس کی تعلیم نہ کرے اور ان دونوں صورتوں میں بھی جب کتمان کا قصد کرے گا تب گناہگار ہوگا **کما صرح به العلامه ابن العربی وغیره.**

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ حضرت فاروق اعظم کا ناسخ کو بیان نہ کرنا کتمان علم نہیں ہے۔ اس کے بعد سنئے کہ حضرت عمرؓ کا امضاء وتنفیذ کی نسبت اپنی طرف کرنا بھی اس کی دلیل نہیں ہے کہ ناسخ کا وجود نہ تھا، یا ان کو اس کا علم نہ تھا، اس لیے کہ اولاً تو بہت سے حضرات سلف یہ جانتے ہوئے کہ فلاں بات آنحضرتؐ نے فرمائی ہے اس کو آنحضرتؐ کی طرف منسوب کر کے بیان کرنے سے ہچکچاتے تھے کہ مبادا کہیں غلط نسبت نہ آنحضرت کی طرف ہو جائے۔ بقیہ صفحہ ۱۶ پر

ارشاد الثقلین

بجواب اتحاد الفریقین

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(چوتھی قسط)

اہل حل وعقد کی بیعت سے خلیفہ وامام کا تقرر

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعدد احادیث سے ثابت کیا گیا تھا کہ خلافت کا انعقاد اہل حل وعقد کی بیعت سے ہوتا ہے اوراس سے لازم آتا ہے کہ خلیفہ وامام کا تقرر نص خداوندی سے نہیں ہوتا، جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں کہ ائمہ منجانب اللہ منصوص ہوتے ہیں۔

اس مدعا کے ثبوت میں سب سے پہلے نہج البلاغۃ جلد دوم مطبوعہ مصر (ص ۷) سے حضرت کا وہ خط پیش کیا گیا ہے جس میں حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کو لکھتے ہیں:

إنه بايعني القوم الذين بايعوا أبابكر وعمر وعثمان على ما بايعوهم عليه فلم يكن للشاهد أن يختار ولا للغائب أن يرد، وإنما الشورىٰ للمهاجرين والأنصار. فإن اجتمعوا على رجل وسمّوه إماماً كان ذلک رضىً فان خرج من أمرهم خارج بطعن أو بدعة ردوه الى ما خرج منه فإن أبى قاتلوه

بہ تحقیق مجھ سے بیعت کی ہے ان لوگوں نے جنھوں نے ابوبکر وعمر وعثمان سے بیعت کی تھی انھیں شرائط پر جن پر ان سے بیعت کی تھی لہٰذا اب نہ حاضر کو اختیار ہے کہ اور کو پسند کرے اور نہ غائب کو حق ہے کہ وہ میری خلافت کو رد کرے، سوا اس کے نہیں کہ مشورۂ خلافت کا حق مہاجرین وانصار کو ہے پس اگر مہاجرین وانصار کسی شخص پر متفق ہوجائیں اور اس کو امامت

علی اتباعه غیر سبیل المومنین وولاه اللّٰه ماتولی.

کے لیے نامزد کردیں تو وہ خدا کا پسندیدہ امام ہوگا پھر اگر مہاجرین وانصار کے کام سے کوئی شخص مخالف ہوجائے کوئی اعتراض کرکے یا کوئی نئی بات نکال کر تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کو پھر اس راہ کی طرف واپس لائیں جس سے وہ نکل گیا ہے اور نہ مانے تو اس سے قتال کریں کیونکہ اس نے ایمان والوں کی راہ کے خلاف کی پیروی کی اور خدا اس کو اسی طرف پھیرے گا جدھر وہ پھرا۔

اس خط کو نقل کرنے کے بعد ابوالائمہ کی تعلیم میں لکھا گیا تھا۔

حضرت علی مرتضیٰؓ کے اس خط سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

۱:-جن لوگوں نے حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم سے بیعت کی تھی انھیں نے حضرت علیؓ سے بھی بیعت کی تھی۔معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ میں اوران تینوں خلیفہ میں کوئی مذہبی اختلاف نہ تھا۔

۲:-خلیفہ کے انتخاب کا حق مہاجرین وانصار کو تھا،خلیفہ کا تقرر منجاب اللہ جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں غلط ہے، ورنہ حضرت علیؓ ضرور لکھتے کہ مجھے تو رسول خلافت کے لیے نامزد کر چکے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ رسول کی نامزدگی کے بعد اس بیعت کا بھی ذکر کردیتے، مگر حضرت علیؓ نے ایسا نہ کیا اور صرف اسی بیعت کو اپنی خلافت کی دلیل قرار دیا۔

۳:-مہاجرین وانصار جس کو امامت وخلافت کے لیے منتخب کرلیں وہ خدا کا پسندیدہ ہوتا ہے،ان کا انتخاب خدا کی مرضی کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

۴:-مہاجرین وانصار کے منتخب کیے ہوئے خلیفہ کو جو نہ مانے اس کو پہلے سمجھانا چاہئے، سمجھانے پر بھی نہ مانے تو واجب القتل ہے اور وہ ایمان والوں کے راستہ سے ہٹا ہوا ہے۔ان تمام ذکر کی ہوئی باتوں کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ تینوں خلیفہ چونکہ مہاجرین میں سے تھے،اور مہاجرین وانصار نے ان کو منتخب کیا تھا، لہٰذا وہ امام برحق اور خدا کے پسندیدہ تھے، ان کا نہ ماننے والا حضرت علیؓ کے

نزدیک واجب القتل ہے اور ایمان والوں کی روش کا مخالف ہے۔

اتحاد الفریقین کے شیعہ مصنف نے حضرت علیؓ کے اس خط کو الزامی قرار دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ''حضرت علیؓ نے اپنے مقابل کے عقائد پیش کر کے اس پر حجت قائم کی ہے''۔

حالانکہ ''ابوالائمہ کی تعلیم'' میں پیشگی ہی لکھ دیا گیا تھا کہ شیعہ حضرات اس خط کو الزامی قرار دینے کی جرأت نہ کریں، اس لیے کہ حسب ذیل وجوہ سے اس کا الزامی ہونا ناممکن ہے۔

''ا:- اس خط میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے اس کے الزامی ہونے کا اشارہ بھی نکل سکے، بلکہ ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود حضرت علیؓ کا عقیدہ یہی تھا انما الشوریٰ سے اخیر تک کا الزامی ہونا بالکل غیر معقول ہے اور اگر یوں بلاقرینہ کسی کلام کو الزامی قرار دینا اور یہ کہہ دینا جائز ہو کہ یہ کلام اس متکلم کا اس کی ضمیر کے خلاف ہے، تو پھر کوئی کلام کسی متکلم کا کسی معنی پر قائم نہیں رہ سکتا۔

۲:- یہ کہ صرف الزامی دلیل پر قناعت کرنا اور تحقیقی دلیل کا ذکر نہ کرنا سنت انبیا کے بالکل خلاف ہے، انبیا علیہم السلام نے کبھی ایسی نہیں کیا، کہ کسی کو اس کے مسلمات سے اگر چہ باطل ہوں الزام دیا ہو۔

۳:- یہ کہ حضرت علیؓ کے دوسرے اقوال جو اسی نہج البلاغۃ میں ہیں، ان سے بھی یہ بات اچھی طرح ثابت ہوتی ہے کہ حضرت علیؓ اپنی خلافت کو منصوص نہ سمجھتے تھے، بلکہ جمہور مسلمین کی طرح بیعت اہل حل وعقد سے خلافت کے انعقاد کا اعتقاد رکھتے تھے، چنانچہ یہ اقوال حدیث نہم میں انشاءاللہ تعالیٰ پیش کیے جائیں گے''۔

حضرت علیؓ کے وہ اقوال جو ابوالائمہ کی تعلیم میں بضمن حدیث نہم ذکر کر دیے گئے ہیں یہ ہیں:

دعونی والتمسوا غیری (الی قولہ) وإن ترکتمونی فانا کاحدکم ولعلی اسمعکم واطوعکم لمن ولیتموہ وانا لکم وزیرا خیرلکم منی أمیراً

حضرت علیؓ سے جب بیعت کی خواہش کی گئی تو فرمایا مجھے چھوڑ دو اور میرے سوا کسی اور کو تلاش کر لو......اور اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں تم میں سے ایک کے مثل رہوں گا اور جس کو تم اپنا حاکم بناؤ شاید میں تم سے زیادہ اس کی اطاعت کروں گا اور یاد رکھو، میرا وزیر ہونا تمہارے لیے زیادہ مفید ہے میرے امیر ہونے سے۔

شیعہ صاحبان! غور سے دیکھئے، اگر حضرت علیؓ کی خلافت منصوص ہوتی تو ان کے لیے یہ کہنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے کہ مجھے چھوڑ دو کسی اور کو تلاش کرلو؟ اور یہ کیسے فرماسکتے تھے کہ جس کو تم خلیفہ بنالوگے میں تم سے زیادہ اس کی اطاعت کروں گا؟ شیعوں کے نزدیک تو امامت بالکل نبوت کے ہم پلہ ہے، کیا کسی نبی کے لیے جائز ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ مجھے چھوڑ دو کسی اور کو تلاش کرو میں تم سے زیادہ اس کی اطاعت کروں گا۔

''ابوالائمہ کی تعلیم'' میں یہ لکھنے کے بعد اس کی تائید میں دوسری روایت نہج البلاغۃ ص ۴۴۵ ج ا سے نقل کی گئی ہے:

والله ما كانت لى فى الخلافة رغبة ولا فى الولاية اربة ولكنكم دعوتمونى إليها وحملتمونى عليها.	اللہ کی قسم مجھے خلافت کی کچھ رغبت تھی نہ حکومت کی کوئی حاجت، بلکہ تم لوگوں نے مجھے خلافت کے لیے بلایا اور اس پر مجھے آمادہ کیا۔

ف - اس کلام سے بھی صاف واضح ہو رہا ہے کہ آپ کی خلافت منصوص نہ تھی بلکہ لوگوں کے اصرار سے اور کہنے سے آپ نے قبول کی، پھر اسی کی تائید میں تیسری روایت نہج البلاغۃ ص ۳۴۱ ج ا سے پیش کی گئی ہے:

أيها الناس ان احق الناس بهذا الامر أقواهم عليه واعلمهم بامر الله فيه فان شغب شاغب استعتب فان ابى قوتل ولعمرى لئن كانت الإمامة لا تنعقد حتى تحضرها عامة الناس فما الى ذلک من سبيل ولكن اهلها يحكمون على من غاب عنها ثم ليس للشاهد أن يرجع ولا للغائب أن يختار.	اے لوگو! خلافت کا سب سے زیادہ حقدار وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ اس پر قابو رکھنے والا ہو، اور اللہ کے حکم کو اس کے متعلق جانتا ہو پھر اگر جھگڑنے والا جھگڑا کرے تو اس کو سمجھایا جائے نہ سمجھے تو اس سے قتال کیا جائے اور قسم اپنی جان کے مالک کی اگر امامت بغیر اس کے منعقد نہ ہو کہ تمام لوگ بیعت کریں، تو اس کی کوئی سبیل نہیں بلکہ جو اس کام کے اہل ہیں وہ غائبین پر بھی حکم لگادیں گے پھر نہ حاضر کو اختیار ہے کہ اس سے رجوع کرے اور نہ غائب کو اختیار ہے کہ کسی اور کو منتخب کرے۔

ف- حضرت علیؓ کے اس کلام نے بالکل صاف کر دیا کہ خلافت کے لیے نہ نص کی ضرورت ہے نہ عصمت کی، بلکہ ان اوصاف کی ضرورت ہے، اور آخر میں یہ بھی بتا دیا کہ انعقاد خلافت اہل حل وعقد کی بیعت سے ہوتا ہے اور تمام لوگوں کی بیعت ضروری نہیں، بلکہ جس قدر اہل حل وعقد اس وقت موجود ہوں انھیں کی بیعت کافی ہے، آخری فقرہ اس کلام کا تو بالکل وہی ہے، جو حضرت معاویہؓ کے خط میں آپ نے لکھا ہے، یہ خط حدیث نمبر ا میں نقل ہو چکا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس خط کا مضمون الزامی نہ تھا۔

ابوالائمہ کی تعلیم میں یہ ساری باتیں لکھ دی گئی تھیں، مگر ''اتحاد الفریقین'' کے مصنف نے کسی بات کا جواب نہیں دیا، بایں ہمہ غایتِ سفاہت سے اس خط کے مضمون کو الزامی ہی قرار دیا، لیکن ہر شیعہ سمجھ سکتا ہے کہ تا وقتیکہ ان باتوں کا جواب نہ دیا جائے اس خط کا الزامی ہونا ناممکن اور اس کے الزامی ہونے کا دعویٰ کرنا اپنی شکست کا صریح اعتراف ہے، اور شیعہ یہ بھی سمجھ لیں کہ ان باتوں کا جواب قیامت تک ان کا کوئی مجتہد نہیں دے سکتا۔

جب شیعہ کی متواتر روایات سے ثابت ہو گیا کہ حضرت علیؓ کا یہی عقیدہ تھا کہ خلافت کے لیے نہ نص کی ضرورت ہے نہ عصمت کی، اور یہ کہ اہل حل وعقد کی بیعت سے خلافت کا انعقاد ہو جاتا ہے، تو مصنف اتحاد الفریقین کے اس قول کی لغویت محتاج بیان نہیں کہ اگر آپ کا عقیدہ ایسا ہی ہوتا تو شوریٰ کے وقت یہ نہ فرماتے کہ میں شیخین کی سیرت پر عمل نہ کروں گا، بلکہ کتاب اللہ اور سنت رسول پر عمل پیرا ہوں گا (ص ۱۸)

اس لیے کہ اولاً تو جس روایت کے حوالہ سے اس کو بیان کیا جاتا ہے وہ متواتر نہیں ہے، برخلاف ان روایات کے جن سے ہم نے اپنا مدعا ثابت کیا ہے، وہ تمام کی تمام حسبِ اقرار شیعہ متواتر ہیں، مصنف اتحاد الفریقین نے اس روایت کے لیے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے صرف شرح فقہ اکبر کا حوالہ تو کوشش کر کے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے، باقی حوالے یا تو قطعاً غلط یا بے سر و پا کتابوں کے حوالے ہیں، مثلاً کتاب الامامۃ والسیاسۃ کہ اس کے مصنف کا آج تک پتہ نہ چل سکا، اور اتنی بات تو بالکل قطعی ہے کہ اس کے مصنف مشہور مورخ علامہ ابن قتیبہ دینوری سُنی نہیں ہیں، (دیکھو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور تاریخ صقلیہ ص ۸) اور تاریخ الخلفاء یا فتح الباری یا صواعق محرقہ میں اس

روایت کا کوئی نشان موجود نہیں ہے، ان تینوں کتابوں میں جو روایت مذکور ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

بدأت بعلي فقلت له ابايعك على كتاب اللّٰه وسنة رسوله وسيرة أبى بكر وعمر فقال فيما استطعت وعرضتها على عثمان فقبل.

یعنی (عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ) میں نے حضرت علیؓ سے شروع کیا اور ان سے کہا کہ آپ سے کتاب وسنت اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی سنت پر بیعت کرتا ہوں، تو حضرت علیؓ نے کہا کہ جہاں تک مجھ کو طاقت ہوگی (ان چیزوں پر عمل کروں گا) اور حضرت عثمانؓ پر اس شرط کو (حضرت علیؓ کے بعد) پیش کیا تو انھوں نے قبول کیا۔

فتح الباری میں ایک اور روایت اس سے بھی صاف ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

هل أنت يا علي مبايعي ان وليتك هذ الأمر على سنة اللّٰه وسنة رسوله وسنة الماضين قبل قال لا ولكن على طاقتي.

یعنی اے علی کیا آپ بیعت کے لیے آمادہ ہیں اگر میں زمام خلافت اس شرط پر آپ کے ہاتھ میں دوں کہ آپ کتاب وسنت اور پہلے خلفاء کی روش پر چلیں گے، تو حضرت علیؓ نے کہا کہ نہیں لیکن جہاں تک مجھے طاقت ہوگی ان سب باتوں پر عمل کروں گا۔

ان روایتوں سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ نے شیخین کی سیرت پر عمل کرنے سے انکار نہیں کیا تھا، اور نہ اس سے ناراضی ظاہر کی تھی، بلکہ اس پر نیز کتاب وسنت پر پورا پورا عمل کرنے کو نہایت دشوار تصور کر کے یہ عذر کیا تھا کہ میں اس کا عہد تو نہیں کرسکتا، لیکن جہاں تک مجھ کو طاقت ہوگی کروں گا، اور حضرت عثمان نے توفیق خداوندی پر بھروسہ کر کے اس شرط کو منظور کرلیا، لہٰذا ان کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کرلی۔

ہاں شرح فقہ اکبر میں بے شک یہ الفاظ ہیں: **فقال علي: احكم بكتاب اللّٰه وسنة رسوله واجتهد رائي** یعنی میں کتاب وسنت سے فیصلہ کروں گا اور اپنی سمجھ سے اجتہاد کروں گا، لیکن اولاً تو شارح فقہ اکبر نے اس روایت کا ماخذ ذکر کیا نہ اس کی سند پیش کی ہے، لہٰذا ایسی روایت سے استدلال کرنا مصنف اتحاد الفریقین کی نادانی ہے۔

ثانیاً:- شارح فقہ اکبر نے خود اس کو ذکر کر کے لکھ دیا ہے کہ:

وقول علی واجتهد رأیی لا یدل علی مجانبة ایاهما وانما قال ذلک لان مذهبه أن المجتهد یجب علیه اتباع اجتهاده ولا یجوز تقلید غیره من المجتهدین ومذهب عثمان وعبدالرحمن بن عوف ان المجتهد یجوز له ان یقلد غیره إذا کان أفقه منه.

اور حضرت علیؓ کا یہ قول کہ ''میں اپنی سمجھ سے اجتہاد کروں گا''، شیخین سے حضرت علیؓ کے پرہیز رکھنے پر دلالت نہیں کرتا، یہ بات تو حضرت علیؓ نے صرف اس لیے کہی تھی کہ ان کا مذہب یہ تھا کہ ہر مجتہد کے لیے اپنے اجتہاد کی پیروی ضروری ہے اور اس کو دوسرے مجتہد کی تقلید جائز نہیں ہے، اور حضرت عثمانؓ وعبدالرحمٰنؓ بن عوف کا مذہب یہ تھا کہ مجتہد کو دوسرے مجتہد کی تقلید جائز ہے جب کہ دوسرا مجتہد اس سے زیادہ فقیہ ہو۔

پس معلوم ہو گیا کہ شرح فقہ اکبر کی روایت سے حضرت علیؓ کی ناراضی اور خط منقولہ بالا کا الزامی ثابت کرنا سخت جہالت ہے۔

افضلیت شیخین باعتراف حضرت علیؓ

علامہ ابن میسم بحرانی کی شرح نہج البلاغہ مطبوعہ طہران جزء ۳۱ میں حضرت علیؓ کا یہ خط بنام حضرت معاویہؓ مذکور ہے:

وکان افضلهم فی الاسلام انصحهم للّٰه ولرسوله کما زعمت الخلیفة الصدیق وخلیفة الخلیفة الفاروق ولعمری ان مکانهما فی الاسلام لعظیم وان المصاب بهما لجرح فی الاسلام شدید. یرحمهما اللّٰه وجزاهما بأحسن ما عملا.

اور اسلام میں سب سے افضل اور اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اخلاص رکھنے میں سب سے بڑھ کر جیسا کہ تم نے بیان کیا خلیفہ صدیق تھے اور خلیفہ کے خلیفہ فاروق، اور قسم مجھے اپنی جان کی کہ بتحقیق ان دونوں کا مقام اسلام میں بڑا ہے اور بتحقیق ان کی وفات سے اسلام کو سخت زخم پہنچا اللہ ان دونوں پر رحمت نازل کرے اور ان کو ان کے اچھے کاموں کا بدلہ دے۔

مصنف اتحاد الفریقین نے اس خط کو بھی الزامی قرار دیا ہے اور اس کے الزامی ہونے پر لفظ **کما زعمت** سے استدلال کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''یہ لفظ عرب میں اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ متکلم کے نزدیک مخاطب کے عقائد باطل و کاذب ہوں''۔ اور اس عبارت کا صحیح ترجمہ ان کے نزدیک یوں ہے۔

''اور اے (معاویہ) تیرے خیال باطل کے مطابق اسلام میں سب سے بڑے اور مخلص خدا ورسول خلیفہ صدیق اور خلیفہ کا خلیفہ فاروق ہیں''

بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن:

لیکن مصنف اتحاد الفریقین نے یہ نہ سوچا کہ اولاً تو **زعم** کا یہ معنی مراد لینے کے لیے یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے، بلکہ اس کے خلاف کی تصریح آگے موجود ہے۔

ثانیاً:- اگر یہی مراد ہوتی تو حضرت علیؓ کو یوں کہنا چاہئے تھا **وزعمت ان افضلھم فی الاسلام الخ** اور اگر ان سب باتوں سے قطع نظر کیجیے تو بھی اس خط کا الزامی ہونا، اور اس کے مضمون کا حضرت معاویہؓ کا خیال باطل ہونا ناممکن ہے، اس لیے کہ فقرۂ مذکورۂ بالا کے متصل ہی حضرت علیؓ نے اپنی جان کی قسم کھا کر یہ بیان کیا ہے کہ ان دونوں حضرات کا مقام اسلام میں بڑا اور ان کی وفات اسلام میں شدید زخم ہے، اور پھر ان کے لیے دعائے رحمت اور خواستگاری جزائے نیک بھی ہے، پس اگر پہلے فقرہ کی مراد وہ ہو جو مصنف اتحاد الفریقین بتاتے ہیں تو مجھے بتایا جائے کہ کیا کوئی معمولی عقل کا انسان بھی وہ فقرہ بولنے کے بعد پچھلے فقرہ بول سکتا ہے، نہ معلوم شیعہ حضرات کو ایسی متضاد باتیں حضرت علیؓ کی طرف نسبت کرنے میں کیا مزہ آتا ہے۔

اگر مصنف ''اتحاد'' یہ کہیں کہ ہم حضرت کے پچھلے فقروں کا وہ ترجمہ کیوں کریں گے، جو آپ نے کیا ہے ہم تو اس کا ترجمہ یہ کریں گے۔

> ''اور میں تو اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان دونوں کا اسلام میں ہونا سخت دشوار تھا اور ان دونوں کے سبب سے جو مصیبت پہنچی وہ اسلام میں ایک شدید زخم تھا، خدا ان پر رحم کرے اور جو ان دونوں نے اچھا عمل کیا ہے اس کا بدلہ دیوے۔'' (اتحاد ص ۲۱)

تو میں کہوں گا کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو یہ آپ کی جہالت کا نہایت زبردست شاہکار ہوگا

اس لیے کہ اولاً مکانھما فی الاسلام لعظیم میں عظیم کا ترجمہ دشوار کوئی عربی داں نہیں کرسکتا۔

ثانیاً:- یہ ترجمہ اگر صحیح ہو تو لازم آئے گا کہ یا تو حضرت علیؓ قرآن سے بالکل ناواقف تھے، یا انھوں نے جان بوجھ کر قرآن کی مخالفت کی، پس وہ معصوم نہ رہے۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ جب حضرت علیؓ نے (آپ کے خیال میں) حضرات شیخین کے اسلام کا انکار کردیا، اور یہ کہا کہ ان کا اسلام میں ہونا سخت دشوار تھا تو ان کے لیے رحمت کی دعا کرنا ناجائز ہے، اس لیے کہ خدا نے فرمایا ہے: **ما کان للنبی والذین اٰمنوا ان یستغفروا للمشرکین** یعنی نبی اور مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے لیے مغفرت ورحمت کی دعا کریں، اور حضرت علیؓ نے شیخین کے لیے اسی خط میں رحمت کی دعا کی ہے، پس لامحالہ یا تو وہ قرآن سے ناواقف تھے یا اس کے مخالف۔

ثالثاً:- **وان المصاب بھما الخ** کا ترجمہ محاورۂ عرب کے بالکل خلاف ہے، محاورہ کی رو سے اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہئے اور بے شک ان دونوں کی موت سے جو صدمہ پہنچا ہے وہ اسلام میں (یعنی اسلام کے لیے) سخت زخم ہے، چنانچہ فتوح احمد بن اعثم کوفی (شیعہ) میں اس خط کا ترجمہ بزبان فارسی اس طرح ہے:

''بجان وسر من کہ منصب ایشاں در اسلام عالی بود و واقعہ وفات ایشاں بر دل من ودلہائے مسلمانان دفع وحملۂ عظیم آورد، خدائے تعالیٰ بر ایشاں رحمت کناد وجزاء ایشاں از کارہائے کہ کردند وسنتہائے محمودہ کہ در بلاد اسلام نہادند وقاعدۂ بد کہ انداختند خیر باد''

مصنف اتحاد الفریقین نے شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اس خط کے ترجمہ میں جو خیانت کی ہے اس کا مقصد شیعوں کو دھوکے میں رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، لیکن اگر شیعوں کو ذرا بھی عقل ہوگی تو وہ ہمارا اور مصنف اتحاد کا ترجمہ گورنمنٹ کے دفتر تراجم میں بھیج کر یا کسی ایسے عربی داں سے جو نہ شیعہ ہو نہ سنی سمجھ کر ہماری صداقت اور اپنے ممتاز الافاضل کی خیانت اور فریب کاری کو معلوم کرسکتے ہیں۔

شیعہ مصنفین جب اس قسم کے خطوط حضرت علیؓ کے پڑھتے ہیں تو ان کی بدحواسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، کبھی یہ کہتے ہیں کہ اس مضمون کا ایک خط حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے نام لکھا تھا اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ لکھا، لیکن یہ نہیں بتاتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے کلام میں اس کا کیا

قرینہ ہے اور حضرت معاویہؓ کے دہرانے سے ان کا کیا منشاء ہے، پھر یہ بھی نہیں بتاتے کہ کس نے یہ لکھا ہے، کہ یہ خط حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے اسی خط کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔

اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے گول مول الفاظ جن سے شیخین کی مدح نکلتی ہے اس لیے لکھ دیتے تھے تا کہ اہل شام کی عداوت زیادہ نہ ہو، اور حضرت علیؓ کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہو۔

لیکن پھر غایت حماقت سے ایسے خطبے بھی نقل کرتے ہیں جن میں شیخین کو (بزعم شیعہ) صراحۃً برا بھلا کہا گیا ہے۔ مثلاً خطبہ شقشقیہ جس میں بالفاظ مصنف اتحاد الفریقین یہ مذکور ہے: اے سننے والو! خبر دار ہو جاؤ خدا کی قسم ابوبکر نے پیراہن خلافت کو زبردستی پہنا............ ابن ابی قحافہ نے پیراہن خلافت کو ناحق زیب تن کر لیا...... میں دیکھ رہا تھا کہ میری میراث خلافت کس طرح تاراج ہو رہی ہے، یہاں تک کہ اول تو اپنے راستہ پر گذر گیا مگر اپنے بعد خلافت کے ڈول کو دوسرے کی طرف پھینک گیا............ مجھے تعجب اور سخت تعجب ہے کہ وہ پہلا جانے والا اپنی حیات میں بیعت خلافت کو توڑ دینے کا اظہار کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اے لوگو میری بیعت توڑ دو میں بہتر نہیں ہوں، جب کہ علی تم میں موجود ہیں، لیکن باوجود اس کے اپنے مرنے کے بعد دوسرے کو خلافت کے لیے معین کر گیا، اور واقعہ یہ ہے کہ پستان خلافت کو دونوں نے آپس میں خوب بانٹ لیا، افسوس کہ خلافت کو ایسے سخت مزاج تندخو کے حوالہ کر گیا جس کی زبان کے زخم نہایت سخت اور کاری تھے، اور جس کا چھونا بھی ناگوار تھا، جس کی گفتار اور کردار دونوں ناہموار تھی، اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں اور زمانہ سازی نے عذر خواہی بھی کرادی۔ (ص ۸-۹)

دوستو! غور سے اقتباس مذکورۂ بالا پڑھو، اور بتاؤ کہ اس خطبہ کو نقل کرنے کے بعد کوئی ادنی درجہ کا عقلمند انسان بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت علیؓ اپنے خطوط میں شیخین کی نسبت مدحیہ الفاظ اس لیے لکھ دیتے تھے، تا کہ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہو، کیا حضرت علیؓ اتنا بھی نہ سمجھتے تھے، کہ خطبۂ شقشقیہ کے بعد شیخین کی نسبت مدحیہ الفاظ لکھنے پر بجز اس کے کہ لوگ مجھ کو جھوٹا، اور خوشامدی سمجھیں اور پہلے سے زیادہ دشمن ہو جائیں اور کوئی نتیجہ نہیں ہوسکتا۔

(جاری ہے)

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

حافظ شمس الدین سخاوی | ابوالخیر محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی ۸۳۱ھ میں پیدا ہوئے، فقہ وعربیت، قرأت وحدیث اور تاریخ میں بڑے فائق تھے، انھوں نے جتنی کتابیں پڑھی اور اساتذہ سے سنی ہیں، ان کا شمار مشکل ہے۔

اساتذہ میں حافظ ابن حجر کے ساتھ ان کو بڑا خصوصی تعلق تھا، مدتوں ان سے وابستہ رہے، انھوں نے حافظ سے ان کی تصنیفات کا اکثر حصہ سنا اور ان کو حاصل کیا، حافظ سے ایسی چیزیں بھی ان کو حاصل ہوئیں جن میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے۔

ابن حجر نے ان کے باب میں فرمایا تھا کہ وہ میری جماعت میں سب سے ممتاز ہیں، ان کے شیوخ کی تعداد چار سو سے زائد ہے، صحیح بخاری کی سند ان کو ایک سو بیس سے زائد محدثوں سے حاصل تھی، ان کے پاس ایک ایسی سند بھی تھی، جس میں ان کے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف دس واسطے تھے۔

جب تک ابن حجر زندہ رہے، ان سے استفادہ کے شوق اور علم کی حرص میں حج کے لیے بھی نہیں نکلے، ان کی وفات کے بعد اپنے والدین کے ساتھ حج کو گئے تو دریا کے سفر میں طور، ینبوع اور جدہ میں حدیثیں سنیں، اوائل شعبان میں مکہ پہنچے، اور حج تک قیام کیا، اس درمیان میں مختلف محدثین سے مختلف مقامات مثلاً غار ثور کی بلندی، کوہ حرا، جعرانہ، منیٰ اور مسجد خیف نیز مکہ کے مشاہد ماثورہ میں حدیثوں کی سماعت کی، حتی کہ خانۂ کعبہ کے اندر اور حطیم میں سماع حدیث کا شرف حاصل کیا۔

پھر ۸۷۰ھ میں دوبارہ حج کیا، اس سفر میں ان کے والدین کے علاوہ بڑے بھائی اور ان کے عیال بھی ساتھ تھے، اس موقع پر بھی مسجد حرام اور طائف میں حدیثیں سنیں۔

تیسری دفعہ ۸۸۵ھ میں حج کو گئے اور ۸۸۶ھ و ۸۸۷ھ میں وہیں رہے، اس دفعہ تین ماہ

مدینہ منورہ میں بھی ان کا قیام رہا۔

چوتھی دفعہ ۸۹۲ھ میں گئے اور ۸۹۳ھ و ۸۹۴ھ وہیں گذارا۔

پانچویں بار ۸۹۶ھ میں یہ سعادت حاصل ہوئی، اور اثناء ۸۹۸ھ تک مکہ میں مقیم رہ کر مدینہ منورہ چلے گئے، وہاں چند مہینے رہے اور روزے وہیں رکھے، پھر شوال ۸۹۸ھ میں مکہ واپس آ کر ایک زمانہ تک رہے، آخر میں مدینہ جا کر مقیم ہوئے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

حافظ سخاوی نے اپنے مسموعات کے ساتھ اپنی تالیفات کی پوری تفصیل ''الضوء اللامع'' میں دی ہے، اور اسی کے ساتھ اس عہد کے اکابر علماء نے جن اونچے الفاظ میں ان کا تعارف کرایا ہے اس کو بھی شرح وبسط میں ذکر کیا ہے۔

کچھ شبہہ نہیں کہ ان کی تالیفات پراز معلومات اور بہت مفید ہیں، بالخصوص ''الضوء اللامع'' جونویں صدی کے رجال علم کی مبسوط تاریخ ہے، مفید معلومات سے لبریز ہے، الا یہ کہ معاصرین کے حق میں ان کا قلم محتاط نہیں ہے، حالانکہ اسی کتاب میں بقاعی، سیوطی، اور دیمی اور بعض دوسرے مصنفین کا جگہ جگہ انھوں نے شکوہ کیا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے معاصرین پر بہت جرح وقدح کی ہے، اور سخاوی نے اس پر بہت برافروختگی کا اظہار کیا ہے۔

سخاوی کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے، مگر اس کے پیش نظر خود ان کی تحریر کا اس عیب سے پاک رہنا نہایت ضروری تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معاصر اس بلاء میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا الا **من عصمه الله**.

الضوء اللامع کے علاوہ اصول حدیث میں ان کی کتاب فتح المغیث اور زبان زد حدیثوں کے بیان میں **المقاصد الحسنة** بھی بہت نافع ہے، یہ تینوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں، اور خوشی کی بات ہے موخر الذکر کتابوں کی اشاعت میں اولیت کا شرف ہندوستان کو حاصل ہے۔

حافظ سخاوی کی وفات ۹۰۲ھ میں ہوئی۔

سیدی علی بن میمون بلاد مغرب کے رہنے والے تھے، آپ کا شمار اکابر اولیاء میں ہے، اجلۂ علماء نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور سلوک کی منزلیں طے کی ہیں، مثلاً مفتی حنفیہ محمد بن رمضان اور مفتی شافعیہ عبدالرحمٰن حموی اور سیدی محمد بن عراق وغیرہم۔

بلادمغرب سے پہلے بیروت آئے، سیدی محمد بن عراق سے پہلی ملاقات وہیں ہوئی، اس کے بعد قاہرہ آئے اور وہاں سے حج کو گئے، حج سے واپسی کے بعد شام میں کچھ دنوں قیام کیا اور بہتوں کی تربیت فرمائی، پھر بروسا میں متوطن ہوئے، آخر میں دوبارہ شام آئے اور وہیں آپ کی وفات ہوئی۔

آپ سخت متبع سنت تھے، فرماتے تھے کہ اگر سلطان بایزید خاں بھی میرے پاس آئے گا تو اس کے ساتھ بھی سنت ہی کے مطابق معاملہ کروں گا، آپ سے جو ملنے آتا تھا، اس کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے، نہ لوگ ان کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔

کوئی عالم ان کے پاس آتا تھا تو اس کی تعظیم کے لیے بکری کی ایک کھال بچھادیتے تھے، وہ بڑے حق گو تھے، کسی کی ملامت کی پروانہیں کرتے تھے، بہت غصہ ور تھے، مریدوں کی کوئی نازیبا حرکت دیکھتے تو ڈنڈے سے مارتے تھے، بادشاہوں اور حکام کا کوئی ہدیہ نہیں لیتے تھے، نہ کوئی منصب قبول فرماتے تھے، اس کے باوجود روزانہ اپنے پاس سے بیس مریدوں کو کھانا دیتے تھے۔

سیدی محمد بن عراق کا بیان ہے کہ سیدی علی بن میمون خرقہ پہننے اور پہنانے کے قائل نہیں تھے، اسی طرح وہ چلّہ میں بٹھانے کے بھی قائل نہیں تھے۔

سیدی علی بن میمون کا حال غزی نے الکواکب السائرہ میں تفصیل سے لکھا ہے، ۹۱۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی ہے۔

سیدی محمد بن عراق آپ کی ولادت ۸۷۸ھ میں ہوئی، آپ جرکسی امراء کی اولاد میں تھے، پہلے سپاہیانہ وضع میں رہتے تھے اور بڑے صاحب دولت وحشمت تھے، پھر سب چھوڑ چھاڑ کر سیدی علی بن میمون کے دامن سے لپٹ گئے۔

قصہ یہ ہوا کہ ایک دن شیخ ابراہیم ناجی وعظ کہہ کر واپس آرہے تھے کہ ان سے راستہ میں ملاقات ہوگئی، یہ گھوڑے سے اتر پڑے اور شیخ کو سلام کیا، شیخ نے پوچھا یہ کون آدمی ہیں؟ لوگوں نے کہا یہ فلاں ہیں، شیخ نے مرحبا کہا، اور ان کے والد کے لیے دعائے رحمت کی، محمد بن عراق نے درخواست کی کہ میں جس غفلت اور بکھیڑے میں ہوں دعا کیجئے اللہ مجھے اس سے نجات دے، شیخ نے فرمایا کہ جہاں ہمارا وعظ ہوا کرتا ہے وہاں آیا کرو اور ہمارے یہاں آمدورفت رکھو ان شاءاللہ فائدہ ہوگا۔

محمد بن عراق فرماتے ہیں کہ میرے دل میں ان کی محبت گھر کر گئی اور رات بہت بے چینی سے کٹی، صبح کو فجر کی نماز میں نے سیدی ابوبکر موصلی کی خانقاہ میں پڑھی، جہاں شیخ کا وعظ ہوتا تھا، اور وعظ میں شریک ہوا، اس کے بعد برکت کا ظہور شروع ہو گیا، میں کھیل کود اور بہت سی فضولیات سے تائب ہو گیا، اور تجارت و زراعت کا مشغلہ اختیار کر لیا۔

محمد بن عراق برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے تا آنکہ تصوف کا خرقہ ان کے ہاتھوں سے پہنا، اور فقہ و حدیث و تفسیر کی تحصیل بھی ان سے کی، ان کے علاوہ دوسرے علماء سے بھی ان فنون کو اور ان کے سوا دوسرے علوم کو حاصل کیا۔

جب شیخ ابراہیم ناجی کی وفات ہو گئی تو وہ سحر کے وقت اور نمازوں کے بعد دعا کیا کرتے تھے کہ کوئی دوسرا مرشد مل جائے، چنانچہ ان کے بعد ان کو سیدی علی بن میمون کی صحبت نصیب ہوئی، جن کے ہاتھ پر ان کی تکمیل ہوئی۔

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ سیدی علی بن میمون سے پہلی ملاقات سیدی محمد بن عراق کی بیروت میں ہوئی، اس کے بعد وہ حج کے لیے چلے گئے تھے، اس درمیان میں سیدی محمد بن عراق ۹۰۵ھ میں مصر گئے اور وہاں شیخ الاسلام زکریا اور علامہ سیوطی وغیرہما سے ان کی ملاقات ہوئی، اس کے بعد جب وطن لوٹے تو والدہ سے اجازت لے کر حج کیا، ۹۱۱ھ میں سیدی علی بن میمون ٹرکی سے حماۃ آئے تو سیدی محمد بن عراق کو خط بھیج کر بلایا، آپ گئے اور چار ماہ دس دن وہاں رہے، پھر سیدی علی بن میمون کے حکم سے بیروت آکر، مریدین کی تربیت فرمانے لگے، کچھ دنوں کے بعد سیدی علی بن میمون کے حکم سے دمشق آئے اور سیدی علی بن میمون بھی حماۃ سے دمشق آ گئے، پھر جب سیدی علی بن میمون مجد المعوش منتقل ہوئے تو آپ بھی ان کے ساتھ منتقل ہوئے، وہیں سیدی علی بن میمون کی وفات ہوئی۔

ان کی وفات کے بعد بیروت میں مکان اور فقراء کے لیے رباط بنوا کر رہنے لگے، پھر اہل دمشق کے اصرار سے آپ دمشق آئے، یہاں جمعرات کا دن مریدوں کی تادیب کے لیے اور جمعہ کا دن تجوید سکھانے کے لیے اور ہفتہ کا دن درس حدیث و فقہ کے لیے مقرر فرمایا۔

آخر آخر میں صفد تشریف لے گئے اور وہیں متوطن ہونے کا ارادہ کر رہے تھے کہ گھر کے لوگوں نے لکھا کہ ۱۶رشوال کو شام کا نائب سفر حج کا ارادہ رکھتا ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ یہ قافلہ آپ کی

ماتحتی ونگرانی میں روانہ ہو، آپ نے جواب میں لکھا کہ میں کسی قافلہ کی سرپرستی نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق نہ ہو۔

جب یہ خط دمشق پہنچا تو وہاں سے جواب آیا کہ آپ تشریف نہ لائیں گے تو اندیشہ ہے کہ اکثر لوگوں کا حج خراب ہوگا، اس لیے استخارہ فرمائیے اور جلد جواب دیجئے۔

اس خط کے بعد آپ آمادہ ہوگئے، اور کہلا بھیجا کہ میں فلاں مقام میں ملوں گا، اور اپنے گھر والوں کو بھی اجازت دے دی کہ دمشقی قافلہ کے ساتھ وہ لوگ حج کے لیے روانہ ہوجائیں۔

چنانچہ آپ مقام موعود میں اس قافلہ کے ساتھ ہوگئے، اور آپ کی برکت سے قافلہ کی روانگی سنت کے مطابق ہوئی، یعنی اونٹوں کے گلے سے گھنٹیاں نکال ڈالی گئیں، اس کے سوا دوسری جو بدعتیں حجاج کے قافلہ میں اس وقت رائج تھیں، یک قلم موقوف کردی گئیں، کہا جاتا ہے کہ سیدی محمد بن عراق نے یہ سفر پیادہ پا کیا تھا۔

یہ ۹۲۴ھ کا واقعہ ہے، اس وقت سے آپ مدینہ پاک میں متوطن ہوگئے، وہاں سے آپ نے بار بار حج کیا اور حرمین میں آپ کی آمد ورفت برابر جاری رہی۔

کئی کتابیں آپ کی یادگار ہیں، ان میں **تنزیہ الشریعة عن الاحادیث الموضوعة** بہترین کتاب ہے، جس کے قلمی نسخے ہندوستان وغیرہ میں پائے جاتے ہیں [۱]۔

۹۳۳ھ میں آپ نے مکہ معظّمہ میں وفات پائی، اور جنۃ المعلیٰ کے دروازہ پر آپ مدفون ہوئے، آپ کے جنازہ میں شریف مکہ ابونمی [۲] ابن برکات بھی شریک تھے۔

امام السلطان ابن الکرکی حنفی ابراہیم بن عبدالرحمٰن نام تھا، قرآن کریم کے علاوہ، اربعین نووی، شاطبیہ، قدوری اور الفیہ کے حافظ تھے، حافظ ابن حجر، شیخ ابن الہمام، سعد الدین دیری اور تقی الدین شمنی وغیرہم کے شاگرد تھے، مصر میں قضاء کے عہدہ پر تھے، مگر یہ عہدہ بقول سخاوی ان کے رتبہ سے فروتر تھا، اس لیے کہ بڑے بڑے افاضل اور قضاۃ ان سے استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، سلطان قاتیبا کے ساتھ ان کو بڑی خصوصیت حاصل تھی، سفر وحضر میں ان کو ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا، ایک بار اس کے سامنے انھوں نے اپنے مرنے کی تمنا ظاہر کی، تو سلطان بے چین ہوگیا، اور کہا کہ

---

(۱) اب مصر میں طبع ہوگئی ہے، (۲) المتوفی ۹۹۰ھ (شذرات)

میری آرزو ہے کہ میں آپ کے سامنے مروں تاکہ آپ مجھ پر قرآن پڑھیں، اور میری قبر کی زیارت کریں اور مجھ کو اس سے نفع پہنچے۔

ابن الکرکی نے تصنیف وتالیف، روایت وتحدیث، درس وافتاء، اور خطبہ ووعظ ہر قسم کی علمی خدمت انجام دی ہے، نہایت ذکی، فصیح وبلیغ، اور خوش تقریر وخوش مذاق تھے۔

آپ نے تین حج کیے تھے، اور اہل حرمین نے آپ سے اور آپ نے اہل حرمین سے علمی استفادہ کیا، ۹۲۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی، سخاوی نے ان کا حال بہت تفصیل سے لکھا ہے، اور بہت زیادہ مدح وثنا کی ہے، علماء واکابر کے ساتھ ان کے حسن سلوک کی، نیز بادشاہ اور امراء کی نگاہوں میں ان کی عظمت وجلالت کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔

عارف باللہ سید احمد بخاری پہلے خواجہ عبیداللہ احرار کی صحبت میں تھے، پھر خواجہ کے حکم سے شیخ الٰہی کی صحبت اختیار کی اور اہل وعیال کو چھوڑ کر ان کے ساتھ بلاد روم (ٹرکی) چلے گئے، شیخ الٰہی ان کا بہت احترام کرتے تھے، فرماتے تھے کہ سید احمد نے ہمارے ساتھ ۶ سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی ہے۔

سید احمد سے دریافت کیا گیا کہ اس مدت میں آپ سوتے کب تھے؟ تو فرمایا کہ صبح کو شیخ الٰہی کا خچر اور گدھا لے کر لکڑی چننے کے لیے میں پہاڑ پر چڑھ جاتا تھا، اور کچھ دیر ان کو چرنے کے لیے چھوڑ دیتا تھا، اور کسی پہاڑ کے سہارے ٹیک لگا کر سو جایا کرتا تھا۔

سید احمد نے شیخ الٰہی سے ساز وسامان لیے بغیر محض متوکلانہ حج کی اجازت چاہی، شیخ نے ان کو ایک گدھا سواری کے لیے اور دس درہم عنایت فرمائے، اس کے علاوہ انھوں نے شیخ کے دسترخوان سے ایک روٹی، اور ایک قرآن پاک اور مثنوی مولانا روم کا ایک نسخہ لیا اور چل کھڑے ہوئے، راستہ میں قرآن پاک کسی نے چرالیا، اور مثنوی سو درم میں بیچ ڈالی، بس اتنے ہی میں انھوں نے حج کیا، اس کے باوجود وہ بہت کشادگی سے خرچ کرتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں تقریباً ایک سال تک مقیم رہے، اور مدت اقامت میں انھوں نے نذر مانی تھی، کہ روزانہ سات طواف اور سات سعی کریں گے، رات کو بھی یا تو طواف کرتے رہتے تھے، یا کوئی دوسری عبادت، یا تھک جاتے تو ذرا ستاتے تھے، مگر سوتے نہ تھے۔

سلوک میں ان کا طریقہ، عزیمت کو اختیار کرنا، سنت پر عمل کرنا، بدعت سے احتراز کرنا، کم ملنا جلنا، فاقہ، خاموشی، شب بیداری اختیار کرنا، روزے رکھنا، اور ذکر خفی پر مداومت کرنا تھا، ان کی وفات ۹۲۲ھ میں ہوئی۔

حافظ قطب الدین قسطلانی شارح بخاری احمد بن محمد بن ابی بکر قسطلانی ۸۵۱ھ میں پیدا ہوئے، فن قرأت میں امام تھے، فقہ وحدیث میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، وعظ گوئی میں بے مثل تھے، ان کی زبان وقلم میں برکت تھی، سخاوی سے ان کی بعض تالیفات سنی تھیں، ان کی شرح بخاری بقول صاحب النور السافر سب شرحوں سے جامع اور بہتر ہے، مواہب اللدنیہ بھی سیرت محمدیہ میں بے نظیر، پُر تاثیر، اور بہت نافع ہے، کہتے ہیں کہ حافظ سیوطی کو ان سے شکایت تھی کہ وہ اپنی کتابوں میں میری تصنیفات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور میرا حوالہ نہیں دیتے۔

قسطلانی کو یہ معلوم ہوا تو قاہرہ سے روضہ تک جہاں سیوطی رہتے تھے، پیدل چل کر معذرت کے لیے گئے، دروازہ پر دستک دی تو سیوطی نے پوچھا کون؟ انھوں نے کہا میں قسطلانی ہوں، میں ننگے پاؤں ننگے سر حاضر ہوا ہوں، تاکہ آپ کا دل میری جانب سے صاف ہو جائے، سیوطی نے اندر ہی سے جواب دیا کہ میرا دل صاف ہو گیا، مگر دروازہ نہیں کھولا، نہ ملاقات کی۔

سخاوی کا بیان ہے کہ انھوں نے متعدد حج کیے تھے، ۸۸۴ھ میں سال بھر مکہ میں رہے، پھر ۸۹۲ھ سے ۸۹۴ھ تک تین سال مسلسل مکہ میں اقامت پذیر رہے، اس کے بعد ۸۹۷ھ میں حنیفہ کے بھائی کے ساتھ حج کے لیے آئے۔

قسطلانی کی وفات ۹۲۳ھ میں ہوئی۔

فاطمہ بنت یوسف تادفی حلبی نہایت نیکوکار و پرہیز گار خاتون تھیں، محدث برہان الدین سے حدیثیں سنی تھیں، انھوں نے دو حج کیے، حلب آکر عمدہ زنانہ پوشاکوں سے بلکہ دنیا سے ان کا دل پھر گیا، بیت المقدس کی زیارت کے بعد تیسرا حج کیا، اور مکہ میں ۹۲۵ھ میں وفات پائی۔

امیر ابن اجا محدث حنفی محمود بن محمد نام تھا، ممالک اسلامیہ کے کاتب اسرار تھے، نہایت عالی رتبہ امیر تھے، ۸۵۴ھ میں ولادت ہوئی، قاہرہ میں ۸۸۴ھ تک تعلیم پائی، ۸۹۰ھ میں حلب کے قاضی مقرر ہوئے، ۹۰۰ھ میں حج کیا، حج سے واپسی کے بعد سلطان غوری نے ان کو قاہرہ بلا کر ۹۰۶ھ میں

کاتب سر (اپنے پرائیوٹ سکریٹری) کا عہدہ سپرد کیا، غوری کے عہد حکومت میں ۹۲۰ھ میں بھی حج کی سعادت حاصل کی۔

اس موقع پر مکہ کے مشہور وفائق محدث جار اللہ بن فہد نے بیس شیوخ کی روایت سے بیس حدیثوں کی تخریج ان کے لیے کی اور اس کا نام تحقیق الرجا لعلو المقر أجا رکھا، قاہرہ واپس ہونے کے بعد مدتوں مریض رہے، سلطان غوری ان کی عیادت وزیارت کے لیے ان کے گھر آیا، غوری کے انتقال کے بعد سلطان طومان بارے نے بھی سابق عہدہ پر ان کو برقرار رکھا، اس کے بعد جب سلطان سلیم خاں (ترکی) قاہرہ آیا تو اس نے بھی وہ عہدہ ان کو تفویض کرنا چاہا، مگر انھوں نے بڑھاپے اور ضعف کا عذر کیا۔

سلطان سلیم نے حلب میں سکونت اختیار کرنے کی ان سے درخواست کی، اس کو انھوں نے قبول کیا اور سلطان کے ساتھ وہ قاہرہ سے حلب آئے اور مرتے دم تک وہیں رہے۔

لوگوں نے ان کی مدح میں نہایت عمدہ عمدہ قصیدے لکھے ہیں، عائشہ باعونیہ نے بھی ایک زوردار قصیدہ ان کی مدح میں لکھا ہے، ۹۲۵ھ میں وفات پائی۔

علامہ عبدالحق سنباطی آپ ابن الہمام اور سعید دیری وغیرہما کے شاگرد تھے، حافظ ابن حجر وعلامہ عینی نے ان کو درس وافتاء کی اجازت دی تھی، جامع ازہر میں بھی انھوں نے درس دیا تھا۔

ایک بار اپنے والد کے ساتھ حج کیا، پھر دوبارہ حج کیا تو مکہ ومدینہ دونوں جگہ قیام کر کے دونوں مسجدوں میں طلبہ کو بہت سے متون کی تعلیم دی، پھر قاہرہ آکر درس وافتاء میں مشغول ہو گئے، آخر آخر میں اپنے تمام متعلقین کو لے کر صرف اس لیے مکہ چلے گئے، کہ ان کو مکہ، یا مدینہ میں مرنا نصیب ہو۔

اس بہانہ سے حجاز کے طلبہ کو بہت نفع پہنچا، اور کئی پشتوں نے ان سے علم حاصل کیا، مکہ میں ۹۳۱ھ میں ان کی وفات ہوئی، اس سفر میں ان کے لڑکے احمد بھی ساتھ تھے، وہ حرم میں وعظ کہا کرتے تھے، اس کے بعد جامع ازہر میں یہ خدمت انھوں نے انجام دی۔

شعرانی کا بیان ہے، اتنا بڑا مجمع کسی دوسرے کے وعظ میں میں نے نہیں دیکھا، احمد کی وفات ۹۵۰ھ میں ہوئی۔

علامہ علاء الدین رومی حنفی ٹرکی کے باشندہ تھے، علی بن احمد نام تھا، سلطان بایزید خاں سریر آرائے سلطنت ہوا، تو اس نے ایک دن ان کو خواب میں دیکھا، اس کو عقیدت ہوگئی، اور اس نے ان کو بلوایا مگر وہ نہیں آئے تو کسی مدرسہ میں مدرس مقرر کردیا، مدتوں درس دینے کے بعد وہ حج کی نیت سے نکلے اور مصر آکر ایک سال وہاں قیام کیا، پھر حج کر کے روم (ٹرکی) لوٹے، تو بایزید خاں نے ان کو افتاء کا منصب سپرد کیا، اور سو درم روزانہ ان کے لیے مقرر کیا۔

اس کے بعد جب بایزید نے قسطنطنیہ میں اپنا مدرسہ تعمیر کرایا، تو اس کو بھی ان کے حوالہ کر کے ان کے وظیفہ میں پچاس درہم روزانہ کا اضافہ کردیا۔

آپ شب و روز تلاوت و عبادت اور تدریس و افتاء میں مصروف رہتے تھے، کسی کو برائی سے یاد نہیں کرتے تھے، دروازہ بند کر کے ہمیشہ ایک بالاخانہ پر رہتے تھے، بالاخانہ کے دروازہ سے سوالات ڈال دیئے جاتے تھے اور وہ جواب لکھ کر لٹکا دیتے تھے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب میں ان کے یہاں امیر و غریب میں کوئی تفریق نہیں تھی، ایک بار سلطان سلیم (ٹرکی) نے سرکاری دفاتر کے ڈیڑھ سو ملازموں اور افسروں کے قتل کا حکم صادر کردیا، جب ان کو خبر ہوئی تو خلاف دستور انھوں نے دربار شاہی کا رخ کیا۔

مفتی حضرات دربار میں نہیں جایا کرتے تھے، جب دربانوں اور دوسرے لوگوں نے ان کو دیکھا تو سخت متحیر ہوئے، پوچھا آپ نے کیسے تکلیف کی؟ فرمایا میں سلطان سے ملنا چاہتا ہوں، اطلاع کرائی گئی، سلطان نے ان کو تنہا بلایا، جب سلطان کے پاس پہنچے تو سلام کر کے بیٹھ گئے، پھر فرمایا کہ مفتیوں کا فرض ہے کہ وہ سلطان کی عافیت کا پورا پورا لحاظ رکھیں۔

میں نے سنا ہے کہ آپ نے ڈیڑھ سو ملازمین سرکار کے قتل کا حکم نافذ فرمادیا ہے جن کا قتل شرعاً جائز نہیں ہے، سلیم بہت تند مزاج تھا، اس نے کہا آپ حکومت کے معاملہ میں دخل نہ دیجئے، یہ آپ کا کام نہیں ہے، آپ نے فرمایا میں تو آپ کی آخرت و عاقبت کے معاملہ میں دخل دے رہا ہوں، اور یہ میرے فرائض میں داخل ہے، آپ اگر ان کو معاف فرمادیں گے تو آپ کی نجات ہے، ورنہ بڑے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

یہ سن کر سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور سب کی جاں بخشی کردی، اس کے بعد تھوڑی دیر ادھر

ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سلطان سے کہا کہ ان لوگوں کے سابق منصب بھی ان کو عطا فرما دیجئے، سلطان نے اس کو بھی قبول کرلیا۔

آپ کی وفات ۹۳۲ھ میں ہوئی۔

مبارک بن عبداللہ حبشی دمشقی آپ بڑے باخدا بزرگ تھے، آپ کے مرید بکثرت تھے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے باب میں نہایت سخت تھے، کسی کی پروانہیں کرتے تھے، شراب بندی کے سلسلہ میں ٹرکی حکومت کے عمال سے کئی بار ٹکر لی۔

آپ اپنے مریدوں کو لے کر ناکوں پر بیٹھ جاتے تھے، اور جب شراب لانے والے شراب لیے ہوئے گذرتے تو مشکوں کو پھاڑ کر شراب بہادیتے، اس کی خبر حکام کو پہنچی تو آپ کے چند مرید کو گرفتار کرکے لے گئے، شیخ مبارک چھڑانے کے لیے گئے تو ان کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

جب قاضی ابن عجلون کی سفارش سے رہا ہوئے تو شیخ کے باقی ماندہ مریدوں نے ہلہ بول کر جیل خانہ کا دروازہ توڑ دیا اوران کے مریدوں کو نکال لائے، حکومت کو طیش آیا اور تقریباً ستر مریدوں کو حکومت نے قتل کرادیا۔

شیخ مبارک اپنے مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ حج کو گئے، مکہ پہنچے، تو پیسہ چک گیا اور فاقے ہونے لگے، شیخ نے ایک مرید سے کہا کہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بازار لے چلو، اور مجھے بیچ کر جو قیمت وصول ہو اس کو باقی لوگوں پر خرچ کرو، اس نے ایسا ہی کیا، شیخ کو کسی عجمی تاجر نے خریدا تھا، پھر اس نے آپ کو آزاد کردیا۔

آپ کی وفات ۹۴۴ھ میں ہوئی، دمشق میں مدفون ہوئے۔

سراج الدین عبادی آپ کا نام عمر تھا، بڑے جید عالم تھے، زہد وتقویٰ اور عبادت گذاری میں بڑے ممتاز تھے، مجاب الدعوات بھی تھے، آپ نے قواعد زرکشی کی شرح لکھی ہے جو دو جلدوں میں ہے۔

آپ حج کے بعد زیارت نبوی کے لیے مدینہ حاضر ہوئے تو رات کے وقت جب لوگ سو رہے تھے، حجرۂ نبوی کا دروازہ خود کھل گیا، آپ اندر گئے، جب زیارت کرکے باہر آئے تو دروازہ آپ سے آپ مقفل ہوگیا۔

آپ کی وفات ۹۴۷ھ میں ہوئی۔

یزید کے عہد میں خانۂ کعبہ کی آتش زنی

تحریر: حمد محمد العریفان
ترجمہ: مولانا ازہر رشید الاعظمی، شارجہ

(دوسری قسط)

جس واقعہ کو ہم بحث و تحقیق کی بساط پر پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ یزید بن معاویہؓ کے دور حکومت میں خانۂ کعبہ کی آتش زدگی ہے، جس کا الزام حضرت ابن زبیرؓ کا محاصرہ کرنے والے بنوامیہ کے لشکر پر لگایا جاتا ہے، اور یہ یزید کے عہد کا دوسرا واقعہ ہے جس کی نسبت میرا خیال یہ ہے کہ بعض مؤرخین نے اس کے تئیں عدل وانصاف سے کام نہیں لیا ہے۔

حوالے کی کتابوں میں خانۂ کعبہ کی آتش زنی

اب ہم ان روایتوں پر بحث کریں گے جو اس موضوع سے متعلق بنیادی مآخذ میں پائی جاتی ہیں، اور اس کا آغاز ہم تاریخ طبری سے کرتے ہیں۔

طبری نے تین روایتیں پیش کی ہیں، [1] پہلی روایت واقدی سے لی ہے، جس میں مذکور ہے:

''خانۂ کعبہ کے اردگرد (ابن زبیر کے رفقاء) آگ جلاتے تھے، اس کی چنگاری ہوا کے ذریعہ خانۂ کعبہ تک پہنچ گئی، جس سے اس کا غلاف اور لکڑیاں جل گئیں۔''

دوسری روایت عروہ بن اذینہ سے نقل کی ہے، جس میں عروہ کے الفاظ یہ ہیں:

''میں اپنی والدہ کے ہمراہ اس روز مکہ آیا جس روز خانہ کعبہ میں آگ لگی تھی، اور وہ جل گیا تھا، میں نے اسے ریشمی غلاف سے خالی دیکھا، اور دیکھا کہ رکن یمانی کا حصہ سیاہ ہوگیا ہے، اور تین جگہ سے پھٹا ہوا ہے، میں نے پوچھا، خانۂ کعبہ کو کیا ہوا؟ تو لوگوں نے عبداللہ بن زبیرؓ کے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس شخص کی وجہ سے آگ لگی، اس نے اپنے نیزہ کے سرے پر ایک شعلہ رکھا تھا، جو ہوا سے اڑ کر خانۂ کعبہ کے غلاف کے اس حصے پر جا کر گرا، جو رکن یمانی اور حجر اسود کے

(۱) تاریخ طبری: ۴۹۸/۵-۴۹۹

درمیان تھا۔''

اور تیسری روایت عوانہ بن الحکم کی زبانی ذکر کی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

''... یہاں تک کہ جب ۶۶ھ بروز ہفتہ ماہِ ربیع الاول کے تین دن گزر گئے تو انھوں نے خانۂ کعبہ پر منجنیقیں پھینکیں اور اسے آگ لگا دی''۔

پس طبری کے یہاں عوانہ بن الحکم کی روایت کے سوا کوئی دوسری روایت نہیں پائی جاتی، جس میں خانۂ کعبہ کی آتش زنی کی تہمت اموی لشکر پر لگائی گئی ہو۔ اور یہ ایسی روایت ہے جو تاریخی تحقیق کے آگے ٹک نہیں سکتی، اس وجہ سے کہ واقدی اور عروہ بن اذینہ کی روایتیں اس کے معارض ہیں، اور ان دونوں روایتوں کی تفصیلات اگرچہ باہم مختلف ہیں، لیکن اس بات پر دونوں متفق ہیں کہ آگ ابن زبیرؓ کے (حمایتی) خیمے سے اٹھی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابومخنف، جو طبری کے یہاں عراقی مکتب فکر کا سربراہ ہے، اور اس دور کے واقعات کا انتہائی اہم راوی ہے، اور اس کے دل میں بنو امیہ کی محبت بھی نہیں ہے، اس نے بھی اس آتش زنی کے واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔[1] اسی طرح وہ معلومات جن کو دوسرے بنیادی مآخذ پیش کرتے ہیں، اس رائے کو غلط ٹھہراتے ہیں۔

دوسرا ماخذ: ''فتوح البلدان'' از بلاذری (وفات ۲۷۹ھ)

اس کتاب کی اکیلی روایت کے الفاظ ہیں:

''اور جب عبداللہ بن الزبیر بن العوام نے مسجد حرام میں پناہ لی اور اس وقت حصین بن نمیر السکونی ان سے برسرِ پیکار تھا، تو ایک دن ابن زبیرؓ کے ایک ساتھی نے اپنے نیزہ کے سرے کی ایک پتی پر آگ رکھی ہوئی تھی، اس روز ہوا بڑی تیز تھی، ایک چنگاری اڑی اور غلاف کعبہ سے جا لگی اور اسے جلا ڈالا، جس سے اس کی دیواروں میں شگاف پڑ گیا اور وہ سیاہ ہو گئیں، یہ ۶۴ھ کا واقعہ ہے''[2]۔

بلاذری کی یہ روایت تصریح کرتی ہے کہ محاصرہ کے دوران خانۂ کعبہ کو جو آگ لگی تھی اس کا سبب ابن زبیرؓ کے ساتھی تھے، اور اس میں اموی لشکر پر اس کارروائی کی تہمت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

تیسرا ماخذ: ''اخبار مکہ'' للازرقی (وفات تقریباً ۲۴۴ھ)

ازرقی نے طبری میں مذکور واقدی اور عروہ بن اذینہ کی روایتوں کو دوسری روایتوں کے

(۱) نبیہ عاقل، ص ۱۱۴ (۲) البلاذری، القسم الاول ص ۵۴

اضافہ کے ساتھ ذکر کیا ہے-جن کو ہم عنقریب ذکر کریں گے-اوران ساری روایتوں میں اس بات کی تصریح ہے کہ آگ لگنے کے اسباب ابن زبیر کی جانب سے تھے، اس سے بنوامیہ کی منجنیقوں کا کوئی تعلق نہیں تھا[۱]۔

ازرقی کی ذکر کردہ پہلی روایت:

''مجھ سے محمد بن یحیی نے بیان کیا، ان سے واقدی نے، اور واقدی سے عبداللہ بن جعفر نے کہ: میں نے ابوالعون سے دریافت کیا کہ خانۂ کعبہ کو کب آگ لگی تھی؟ کہا کہ: ہفتہ کے دن ماہِ ربیع الاول کی ابتدائی تاریخوں میں، یزید بن معاویہؓ کی وفات کی خبر پہونچنے سے انتیس روز پہلے، میں نے پھر پوچھا کہ آتش زدگی کا سبب کیا تھا؟ کہنے لگے: آگ ہماری ہی وجہ سے لگی تھی، ہوا یہ کہ ہم میں سے ایک شخص -جس کا نام مسلم بن ابی خلیفہ المذحجی تھا- وہ اوراس کے ساتھی خانۂ کعبہ کے گرد اپنی جھونپڑیوں میں آگ روشن کرتے تھے، اس نے ایک تند وتیز ہوا والے دن اپنے نیزہ کے لوہے کو تیل میں ڈبو کر آگ استعمال کی، جس سے چنگاری اڑی اور خانۂ کعبہ کو آگ لگی جو اس کی لکڑیوں تک پہونچ گئی''۔

دوسری روایت: ''مجھ سے میرے دادا نے بیان کیا، ان سے سعید بن سالم نے، اوران سے عثمان بن ساج نے کہ: مجھ سے مکہ کی ایک بوڑھی خاتون نے جو مکہ مکرمہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ تھیں، مجھے واقعات سنایا کرتی تھیں، میں نے ان سے ایک دن عرض کیا کہ مجھے کعبہ کی آتش زدگی کے بارے میں بتائیے کہ اسے آگ کیسے لگی تھی؟ کہنے لگیں کہ: مسجد میں بہت سارے خیمے لگے ہوئے تھے، انھیں میں ایک خیمہ سے آگ اٹھی جس سے خیمے جل گئے اور مسجد میں آگ بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ آگ کعبہ تک جا پہونچی اور وہ جل گیا۔

چوتھا ماخذ: الکامل لابن الاثیر

انھوں نے دو متضاد روایتیں ذکر کی ہیں[۲] پہلی روایت میں ہے:

''... انھوں نے (یعنی بنوامیہ کی فوج نے) کعبہ پر منجنیق سے حملہ کیا اوراسے آگ سے جلا ڈالا''۔

اور دوسری روایت میں ہے:

---

(۱) الازرقی: ۱/۱۹۶-۲۰۰ (۲) ابن الاثیر: ۳/۲۱۶

''ابن زبیرؓ کے ساتھیوں نے کعبہ کے گرد آگ روشن کر رکھی تھی، جس کی چنگاری تیز ہوا کے ذریعہ کعبہ تک پہونچ گئی اور اس کے غلاف اور لکڑیوں کو جلا ڈالا''۔

ان دونوں روایتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ابن اثیر لکھتے ہیں کہ:

''پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، اس لئے کہ بخاری نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے کہ ابن زبیرؓ نے خانۂ کعبہ کو یوں ہی جلا ہوا چھوڑ دیا تھا، تاکہ اسے اس حالت میں دیکھ کر لوگوں کے اندر شامیوں کے خلاف جنگ میں جوش پیدا ہو''

لیکن ظاہر ہے کہ اس دلیل کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ اموی فوج کی منجنیقیں ہی کعبہ کی آتش زدگی کا سبب بنی تھیں، نیز ابن زبیرؓ کے کعبہ کو جلتا ہوا چھوڑ دینے میں بنوامیہ کے اسے جلانے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ یہ دلیل تو خود ابن زبیرؓ کے خلاف استعمال کی جاسکتی ہے کہ انھوں نے کیونکر خانۂ کعبہ کو آگ میں جلتا ہوا محض اپنی فوج کو جنگ پر ابھارنے اور انھیں مشتعل کرنے کے لئے چھوڑ دیا، اور ابن اثیر کی پہلی روایت عوانہ ابن الحکم والی ہی روایت ہے جو انھوں نے طبری سے لی ہے، جیسا کہ اس روایت کی عبارت سے ظاہر ہے۔

پانچواں ماخذ: ''مروج الذہب'' از مسعودی

مصنف لکھتے ہیں: ''پھر منجنیق و عراوات کے پتھر خانۂ کعبہ پر گرنے لگے، پتھروں کے ساتھ آگ، آتش گیر سیال، کتان کے فلیتے اور اس کے علاوہ دوسرے آتش گیر مادّے بھی خانۂ کعبہ پر پھینکے گئے اور پھر خانۂ کعبہ منہدم ہوگیا اور اس کا ڈھانچہ جل گیا۔''(۱)

مسعودی کا شمار ان مآخذ میں ہوتا ہے کہ جب وہ یزید بن معاویہؓ کے عہد حکومت کے واقعات کو بیان کرے تو اسے اختیار کرنے والے مؤرخ کو شدید احتیاط برتنا ضروری ہے، اس لئے کہ وہ شیعیت کے رجحانات رکھتا ہے، بلکہ شیعہ اسے اپنے شیوخ میں شمار کرتے ہیں، جیسا کہ ہم پہلے اس کا ذکر کر چکے ہیں، بالخصوص اس صورت حال میں کوئی مؤرخ صرف مسعودی پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ ان دوسری متعدد روایتوں کی تحقیق اور چھان بین نہ کرلے جو اس سلسلہ میں تاریخ طبری، اخبار مکہ، فتوح البلدان اور الکامل میں موجود ہیں۔

---

(۱) المسعودی: ۳/۷۱

اس پوری بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ بنی امیہ کے دور کے بنیادی مآخذ میں کوئی ایسی دلیل نہیں پائی جاتی جو قطعی طور پر یہ ثابت کرتی ہو کہ کعبہ میں آتش زنی اموی فوج کی منجنیقوں سے ہوئی تھی، بلکہ بیشتر روایات میں تو یہ صراحت موجود ہے کہ آگ کا سبب حضرت ابن زبیرؓ کا خیمہ تھا، جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ بنی امیہ اس عمل سے بری تھے۔

خانۂ کعبہ کی آتش زدگی کا واقعہ بعض نئی کتابوں میں

بعض نئے مؤرخین نے یزید بن معاویہؓ کے عہد حکومت میں خانۂ کعبہ کی آتش زدگی کے واقعہ کو سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے، گویا کہ یہ واقعہ رونما ہی نہیں ہوا، ان مؤرخین میں "**محاضرات في تاريخ الدول الإسلامية**" کے مصنف شیخ محمد الخضری، "**التاريخ السياسي للدولة العربية**" کے مصنف ڈاکٹر جمال الدین سرور، اور "**الدولة العربية الإسلامية**" کے مصنف ڈاکٹر علی حسنی الخربوطلی ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے مورخین نے اس آتش زدگی کی ذمہ داری بنوامیہ کے سر ڈالی ہے، جو حسبِ ذیل ہیں:

اولاً: حسن ابراہیم حسن، جو اپنی کتاب "تاریخ الاسلام" میں لکھتے ہیں:

"... پھر حصین اور اس کے ساتھی کعبہ کو زبردست نقصان پہونچانے کے بعد مکہ کا محاصرہ اٹھا کر واپس چلے گئے (الف)، مسعودی کے بقول منجنیق وعراوات کے پتھر کعبہ پر گرتے تھے، پتھروں کے ساتھ آگ، تیل اور کتان کے فلیتے، اوران کے علاوہ دوسرے آتش گیر مادّے کعبہ پر پھینکے گئے، جس سے کعبہ منہدم ہوا اور اس کا ڈھانچہ جل گیا (ب)"[1]

حوالہ: الف، ابن الاثیر، ب، مسعودی۔

یہاں مصنف نے مسعودی کی روایت کو اختیار کیا ہے، بلکہ اس روایت کو بعینہ نقل کیا ہے، جس کا مقصد بظاہر اپنے اس خیال کی تائید حاصل کرنا ہے کہ بنوامیہ کے لشکر نے کعبہ کو آگ لگائی تھی، جبکہ انہوں نے ان بقیہ روایتوں کو نظر انداز کر دیا ہے جن کو طبری، ازرقی، اور بلاذری نے ذکر کیا ہے، اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یزید کے دورِ حکومت میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق

(۱) حسن ابراہیم حسن: ۱/۸۲-۷

صرف مسعودی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، نیز انہوں نے مسعودی کی اس روایت پر اپنے اطمینان ورضامندی کی وجہ بھی بیان نہیں فرمائی، حالانکہ اس کے علاوہ دوسری روایتیں اجمالی طور پر مسعودی کی اس روایت کے برخلاف ہیں، رہا مصنف کا ابن اثیر پر ایک دوسرے ماخذ کی حیثیت سے اعتماد کرنا، تو ہم اس کی بابت پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ابن اثیر پر ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے اعتماد کرنا، اور طبری جیسے دوسرے بنیادی مآخذ سے چشم پوشی کر جانا صحیح اور درست نہیں ہے۔

ثانیاً: ڈاکٹر سید عبدالعزیز سالم، جو اپنی کتاب "**تاریخ الدولة العربية**" میں لکھتے ہیں:

"اور ۳ ربیع الاول ۶۴ھ کے دن جبلِ ابوقبیس پر نصب منجنیقوں سے کعبہ پر حملہ کرنے لگے، منجنیقوں اور عراوات کے پتھر بیت الحرام پر گرنے لگے، شامیوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انہوں نے خانۂ کعبہ پر آگ، آتش گیر سیال، کتان کے فلیتے اور اس کے علاوہ آتش گیر مادے بھی پھینکے (الف) چنانچہ منجنیقیں خانۂ کعبہ کے ایک گوشے سے جا ٹکرائیں اور اس میں لگی ہوئی آگ کے ساتھ اسے منہدم کر دیا (ب)۔"(۱)

حوالہ (الف) المسعودی، (ب) ابنِ قتیبہ۔

پہلا ماخذ مسعودی ہے، جس پر اس مؤرخ نے اعتماد کیا ہے، بلکہ بعینہ اس کی عبارت نقل کی ہے، اور اس میں وہی بات کہی گئی ہے جو اس سے پہلے کہی جا چکی ہے، اور جہاں تک "**الإمامة والسياسة**" نامی کتاب سے استدلال کا تعلق ہے، تو یہ استدلال نا قابلِ قبول ہے، کیونکہ اس کتاب کی نسبت ابنِ قتیبہ کی طرف محلِ نظر ہے، اور ان وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، لائقِ التفات نہیں ہے۔

ثالثاً: ڈاکٹر عبدالمنعم ماجد اپنی کتاب "**التاريخ السياسي للدولة العربية**" میں لکھتے ہیں:

"اور حصین نے ابنِ زبیر کے ساتھ جھڑپیں شروع کر دیں، اور حرم پر منجنیقوں اور آتش گیر سیال سے حملہ کر دیا، جس سے کعبہ کی دیواریں پھٹ گئیں (الف)، اس کے پتھر بکھر گئے (ب) اور اس کا غلاف اور اس کی لکڑیاں جل گئیں، اگر چہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کعبہ کی آتش زدگی اس آگ کا نتیجہ تھی

---

(۱) السید عبدالعزیز سالم، ص ۴۰۸

جسے ابنِ زبیر کے ساتھی کعبہ کے گرد روشن کرتے تھے، چنانچہ اسی آگ کی چنگاری اڑ کر کعبہ کے غلاف اور اس کی لکڑیوں سے لپٹ گئی اور وہ جل گئے (ج)[1]

حوالہ: (الف) فتوح البلدان للبلاذری، (ب) الازرقی، (ج) الکامل۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالمنعم صاحب کو یہ بات مکمل طور پر تسلیم ہے کہ خانۂ کعبہ کی آتش زدگی اموی لشکر کے سپہ سالار حصین بن نمیر کا کعبہ کو منجنیقوں اور آتش گیر سیال سے نشانہ بنانے کا نتیجہ تھی، اور شاید اسی وجہ سے موصوف نے دوسری روایتوں کو رد کر دیا ہے جن میں سے ایک روایت کا آغاز (وان قیل) کے لفظ سے کیا ہے، یہاں یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جن دو کتابوں کا حوالہ اموی لشکر کی وجہ سے آتش زدگی کے واقعہ کو ثابت کرنے والے ماخذ کی حیثیت سے دیا ہے، وہ فتوح البلدان اور اخبار مکہ ہیں، اور وہ معلومات جو ان کتابوں میں پیش کی گئی ہیں، وہ موصوف کی بیان کردہ باتوں سے مطلقاً متفق نہیں ہیں، چنانچہ مجھے فتوح البلدان میں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جو حصین بن نمیر کے ہاتھوں کعبہ کی آتش زنی کے واقعہ کی جانب دور سے بھی اشارہ کرتی ہو۔ اس واقعہ سے متعلق بلاذری نے صرف ایک روایت ذکر کی ہے جو پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔ اسی طرح ان متعدد روایتوں میں بھی جن کو ازرقی نے قلم بند کیا ہے اس واقعہ کی طرف اس مفہوم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس کو مصنف نے بیان کیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ ایسا کیونکر ہوا، شاید یہاں مصنف کو کوئی اشتباہ لاحق ہو گیا ہے۔

الغرض اموی فوج پر کعبہ کی آتش زنی کا الزام ایک ایسا الزام ہے جس کے ایسے مستند اور ایسے قطعی دلائل نہیں ہیں جو شک وشبہہ سے بالاتر ہوں، یہ الزام بھی اموی لشکر پر مدینہ کی تین دن تک بے حرمتی کے اُس الزام کی طرح ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خونریزی کی، مال ودولت لوٹا اور آبروریزی کی، لیکن اس کے باوجود ہم بیشتر نئے مؤرخین کو -جن کا ذکر گزر چکا ہے- دیکھتے ہیں کہ وہ ان واقعات کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں، جیسے وہ حقائق پر مبنی ہوں، اسی وجہ سے ہماری تاریخ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں غور وفکر، اور بحث وتحقیق کی ضرورت ایک لازمی شے بن گئی ہے۔

---

(۱) عبدالمنعم ماجد ۲/۸۸-۸۹

اسلامی کتب خانے

(چھٹی قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جھنی
ترجمہ و تلخیص: مسعود احمد الاعظمی

مسجدوں اور جامع مسجدوں کے کتب خانے

مسجد مسلمانوں کی سب سے پہلی درس گاہ ہے، اور وہ اس مذہبی، تہذیبی اور تمدنی شعاع ریزی کا مرکز ہے جو بڑھتے بڑھتے روئے زمین کے ان تمام خطوں تک پھیل گیا، جہاں مسلمانوں نے فتح و کامرانی کے پرچم لہرائے۔

تعلیم و تعلم نے مسجد کو اس کے قیام کے دن سے اپنا مرکز بنایا، چنانچہ آنحضرت ﷺ -مسجد میں بیٹھ جاتے اور مسلمان آپ کے گرد حلقہ لگا لیتے اور آپ سے علم و دین حاصل کرتے، صحابہ و تابعین -رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین- بھی اسی طرز پر چلے، اور انھوں نے مساجد میں علم کی نشستیں قائم کیں، خواہ مدینہ میں ہو یا باقی اسلامی بلاد و اقالیم میں، جن کو انھوں نے فتح کیا اور ان میں مسجدیں اور جامع مسجدیں تعمیر کیں۔

اس طرح مسجد علم کا مرکز اور معرفت کا سرچشمہ تھی، کیونکہ اس نے مدرسے کے ظہور میں آنے سے پہلے اس خدمت کو انجام دیا تھا۔

مسجدیں اور جامع مسجدیں اسلامی تاریخ کے ہر دور میں توجہ کا مرکز رہی ہیں، اس لیے کہ ان کی تعمیر اور ان کے اندر مناسب سہولیات کی فراہمی خلفاء و حکام اور وزراء و علماء کا نصب العین ہوا کرتی تھی، تا کہ ان کے اندر مذہبی فرائض کے ساتھ ساتھ تعلیم و تعلم کا کام بھی ہو سکے۔

اسلامی تاریخ میں تعلیم کے فروغ و ترقی کا آغاز فطری طور پر درس کے ان حلقوں سے ہوتا ہے، جو مساجد میں منعقد کیے جاتے تھے، اور مساجد میں کتابوں کا وجود ان مصاحف کے ساتھ مربوط

ہے جوان کے اندر فراہم کیے جاتے تھے، اس لحاظ سے قرآن کریم کی تلاوت عبادت کا ایک جز ہے، اس لیے مصاحف ان چیزوں میں جو مسجدوں پر وقف کی جاتی تھیں، سب سے قدیم ہے۔

تعلیم وتربیت کی تاریخ بھی مسجد کے ساتھ بہت مضبوطی سے جڑی ہوئی ہے، مساجد کے عہد آغاز ہی سے ان میں تعلیم کے حلقے قائم ہونے لگے، اور وہ سالوں اور صدیوں تک اسی طرز پر اور مختلف اسلامی ممالک میں بغیر کسی انقطاع کے چلتے رہے، مسجد کو تعلیمی مرکز بنانے کا غالباً سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تعلیم اسلام کے ابتدائی زمانوں میں دینی ومذہبی ہوا کرتی تھی، جو دین کی تعلیمات کی تشریح کرتی، اوران کے قواعد واحکام کی توضیح کرتی۔

اور ظاہر ہے ان تعلیمات کا مسجد سے بہت گہرا تعلق تھا، پھر جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے، مسلمانوں نے اپنے ابتدائی زمانے ہی سے مسجدوں کو بہت وسیع مفہوم میں رکھا ہے، چنانچہ وہ عبادت یعنی نماز قائم کرنے کی جگہ بھی تھی، مسجد ہی میں قبائل کے وفود اور حکومتوں کے سفراء کا استقبال کیا جاتا تھا؛ اسی میں دستاویزات، عہد نامے اور صلح نامے تحریر کیے جاتے تھے، جہاد کا اعلان اور فوجوں کی پرچم بندی کا کام بھی مسجد ہی سے ہوتا تھا؛ اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی مسائل سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے بھی مسجد ہی کا منبر استعمال ہوتا تھا، اور مسجد ہی وہ جگہ ہے جہاں سے اسلامی تہذیب کی ہوائیں دنیا کے چپے چپے تک پہنچیں۔ مسجد اسلام کے عہد آغاز ہی سے مسلمانوں کی کردار سازی اوران کی علمی نشو ونما اور تربیت میں بنیادی کردار ادا کرتی رہی، اوراس نے انسانی تہذیب کو علمی وتعلیمی ترقی میں درجۂ کمال اور انتہا تک پہنچانے کا کام کیا۔

ابن تیمیہ- رحمۃ اللہ علیہ- آنحضرت-صلی اللہ علیہ وسلم- کے عہد میمون میں مسجد کی خدمات کا خلاصہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ائمہ کے مراکز اورامت کی اجتماع گاہ مسجدیں ہی تھیں، آنحضرت-صلی اللہ علیہ وسلم- نے اپنی مسجد مبارک کی تعمیر تقوی کی بنیاد پر کی، اس میں نماز بھی ہورہی ہے، تلاوت بھی ہورہی ہے، ذکر اور تعلیم کے حلقے بھی لگ رہے ہیں، خطبے اور تقریریں بھی ہورہی ہیں، سیاسی امور بھی نمٹائے جارہے ہیں، فوجوں کی پرچم بندی اور امراء کا تقرر بھی ہورہا ہے، سرداروں کا انتخاب بھی ہورہا ہے، اور اسی مسجد میں اہم دینی ودنیوی امور میں مسلمان آپؐ کے پاس جمع بھی ہوتے

ہیں''۔[۱]

تعلیم بالغان میں مسجد کا شروع ہی سے نمایاں کردار رہا ہے،[۲] چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ بعض صحابہ-رضوان اللہ علیہم اجمعین-خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد قبا میں تعلیم دیا کرتے تھے۔[۳]

اور بعض تاریخی روایات میں تصریح ہے کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم-رضی اللہ عنہ-غزوۂ بدر کے کچھ ہی بعد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو آپ نے دارالقراء میں پڑاؤ کیا (۴)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مدینہ منورہ میں کوئی ایسی عمارت موجود تھی جو درس وقرأت کے لیے مخصوص تھی۔

مسجد نبوی اسلام کا وہ پہلا ادارہ سمجھی جاتی ہے، جہاں تعلیم کی خشت اول رکھی گئی، جہاں مسلمان مدینے کے علماء وفقہاء کے گرد حلقے قائم کرتے تھے، اور ان سے دینی، فقہی اور لغوی علوم حاصل کرتے تھے، اور ابن خلکان کا بیان ہے کہ مسجد نبوی میں درس کے حلقے منعقد کیے جاتے تھے، ان میں مشہور ترین حلقہ فقیہ اہل مدینہ ابوعثمان بن ربیعہ معروف بہ ربیعہ رائے کا ہوا کرتا تھا، اور امام مالک اور حسن رحمہم اللہ جیسے اشراف مدینہ علم حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، اور ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ان کا حلقہ بہت بڑا تھا۔

اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے کے ساتھ مسلمانوں نے مفتوحہ علاقوں میں مسجدیں تعمیر کیں، تاکہ ان سے اسلامی مرکز اور اسلامی تہذیب وثقافت کی اشاعت کے لیے علم ومعرفت کے ادارے کا کام لیا جاسکے، اور اسلامی تہذیب وتمدن پر زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ لوگوں کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ مسجدوں میں قرآن کریم کے نسخے اور دوسری مفید اسلامی کتابیں لاکر وقف کردیا کرتے تھے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ مسجد کا کتب خانہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب مسلمانوں نے مسجدوں

(۱) مجموع الفتاویٰ: ۳۵/ ۳۹
(۲) احمد عبدالرزاق احمد، الحضارۃ الاسلامیہ بالعصور الوسطی: ۲۱
(۳) الغزالی، احیاء العلوم: ۱/ ۷
(۴) مقریزی، خطط: ۲/ ۳۶۲، سیوطی، حسن المحاضرۃ: ۲/ ۱۸۵

میں منعقد ہونے والے تعلیمی حلقوں کے ذریعے ان کو درس گاہ بنایا، لہذا ان میں کتابوں کا ودیعت کیا جانا ایک فطری امر تھا، اس لیے کہ کتابوں کے بغیر تعلیم نہیں ہے، تعلیمی سرگرمی میں کتابیں رکن اساسی ہیں، جن کے بغیر تعلیم کا عمل آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اور جب یہ معلوم ہو چکا کہ تعلیم اپنے مختلف مراحل اور بیشتر فروع میں ماضی قریب تک مسجدوں اور جامع مسجدوں میں انجام دی جاتی تھی، تو اس سے مساجد کے ساتھ ملحق کتب خانوں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، چنانچہ بیشتر مساجد اور خاص طور سے اہم مساجد کا ایک اپنا خاص کتب خانہ ہوا کرتا تھا، اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، یہ کتب خانے صرف مذہبی کتابوں پر مشتمل نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ علمی وادبی کتابیں بھی اس میں ہوا کرتی تھیں۔

اسلامی شہروں کی بعض اہم مسجدوں کو بہت شہرت حاصل ہوئی، اور وہ تعلیم وتدریس کے بڑے مراکز میں شمار ہونے لگیں، جہاں عالم اسلام کے گوشے گوشے سے تحصیل علم کے لیے طلبہ آیا کرتے تھے، اوران کی تعلیم کے لیے مسجدوں ہی میں حلقہ ہائے درس منعقد ہوا کرتے تھے، چنانچہ مکہ مکرمہ کی مسجد حرام، مدینہ منورہ کی مسجد نبوی، دمشق کی جامع اموی، قاہرہ کی جامع ازہر، بغداد کی جامع منصور، قرطبہ اور طلیطلہ وغیرہ کی مسجدیں درس کے حلقوں سے معمور رہا کرتی تھیں، یہ تو صرف چند مثالیں ہیں ورنہ مختلف اسلامی شہروں اور علاقوں میں اس قسم کی مساجد کی بڑی تعداد تھی۔

حرم مکی اور مسجد نبوی میں علم ومعرفت کی بیشتر شاخوں کی کتابوں کا بہت بڑا کلیکشن تھا، جس میں کتابوں کی فراہمی میں سربرآوردہ اور سرمایہ دار مسلمانوں نے ہر زمانے میں حصہ لیا تھا۔

حرمین شریفین کے کتب خانے:

تاریخی بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت زیادہ لوگوں نے کتابوں کے غیر معمولی مجموعے حرمین شریفین میں ہدیہ کیے تھے، اور مؤرخین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ حرم مکی کا کتب خانہ عہد عباسی میں موجود تھا، کیونکہ تاریخی تحقیقات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ مسجد حرام میں ان دونوں گنبدوں کے اندر جن کو خلیفہ مہدی نے تعمیر کیا تھا کتابوں کا ذخیرہ تھا، چنانچہ چاہ زمزم کے بغل میں اس کی پوربی سمت میں اس حوض سقایہ پر ایک قبہ تھا جہاں سے حضرت عباسؓ حُجاج کو پانی پلایا کرتے تھے، اور دوسرا قبہ ان محفوظات کی جگہ پر مشتمل تھا، جہاں قرآن کریم اور وہ کتابیں رکھی جاتی تھیں جو حرم کو

ہدیہ کی جاتی تھیں۔[(۱)]

ان دلائل پر اعتماد کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ مکتبۂ حرم مکی کی خشت اول دوسری صدی ہجری میں تقریباً ۱۶۰ھ میں رکھی گئی تھی، اور کتابیں اور قرآنی نسخے حرم کے اندر کے خزانے میں باقی رہے، مگر اس سیلاب کی وجہ سے جس سے ۴۱۷ھ میں حرم کو بہت نقصان پہنچا تھا، بہت سارے ضائع اور برباد ہوگئے۔[(۲)]

اور مدینہ منورہ کی مسجد نبوی تو ایک عظیم الشان کتب خانہ بن گئی تھی، جس میں ان کتابوں کا ذخیرہ تھا، جن کو سلاطین وحکام اور اہل علم وثروت نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کے لیے وقف کیا تھا، چنانچہ ۵۸۰ھ میں اس میں دو بڑے کتب خانے تھے جو وقف شدہ کتابوں اور قرآن کریم کے نسخوں پر مشتمل تھے، اور ابراہیم بن حماد رواشی کلابی متوفی ۷۵۵ھ کے پاس نہایت بیش قیمت کتابیں تھیں، جن کو اس نے مسجد نبوی کے لیے وقف کردیا تھا، اور ملک فارس کے فرمانروا شاہ شجاع بن محمد مظفر یزدی متوفی ۷۸۷ھ نے مسجد نبوی کی زیارت کے وقت اس کے لیے ایک کتب خانہ وقف کیا تھا، جس کے بارے میں سخاوی نے لکھا ہے کہ:

> ''حرم مدنی میں اس کے بہت سے آثار ہیں، جن میں وہ بہترین ذخیرہ بھی ہے جو بہترین اور عمدہ کتابوں پر مشتمل ہے، علم کا کوئی ایسا طلب گار نہیں ہے جو اس کے جواہر پاروں سے مستفید نہ ہوتا ہو''۔[(۳)]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض بڑی مساجد میں ایک سے زیادہ کتب خانے پائے جاتے تھے، جیسا کہ یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ:

''اس کے زمانے میں ''مرو'' کی جامع مسجد میں ۲ رکتب خانے تھے، ایک کو ''عزیزیہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، جس کو عزیز الدین ابوبکر نام کے ایک شخص نے وقف کیا تھا، اس کتب خانے کی کتابیں دس ہزار ۱۰۰۰۰ جلدوں میں تھیں، دوسرا ''کمالیہ'' کے نام سے مشہور تھا، لیکن اس کی نسبت کا

---

(۱) ازرقی: اخبار مکة وما جاء فیها من الآثار: ۳۱۲/۲

(۲) سیوطی: الوسائل إلی معرفة الأوائل: ۵۳

(۳) التحفة اللطیفة فی تاریخ المدینة الشریفة: ۱۱۴/۱

مجھے علم نہیں کہ کس طرف نسبت کرکے اس کو ''کمالیہ'' کہا جاتا تھا''۔ (۱)

بغداد، شام، اندلس اور مصر کی مسجدوں میں کتب خانے بہت رواج پذیر ہوئے، یاقوت نے ''معجم البلدان'' میں زید بن حسین کندی بغدادی متوفی ۵۹۷ھ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ جامع اموی میں اس کا ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ (۲)

عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں، بغداد کے مغربی حصے میں، دجلہ کے کنارے رباط بسطامی کے بالمقابل ''قمریہ'' کے نام سے ایک مسجد کی تجدید کی تھی، اور اس کے واسطے ساز وسامان اور فروش، سونے وچاندی کی قندیلیں، اور شمعدان وغیرہ مہیا کیے تھے، اور مسجد سے ملحق ایک کتب خانہ بھی قائم کیا تھا، اور بہت ساری کتابیں اس کے لیے بہم پہنچائی تھیں۔ (۳)

اور مستنصر ہی نے عبدالعزیز بن دلف کو مستنصریہ کے کتب خانے کا لائبریرین اور نگراں مقرر کیا تھا، یہ شخص اس سے قبل شریف زیدی نامی مسجد کے کتب خانے کا لائبریرین بھی رہ چکا تھا، جس کو حسن بن علی بن احمد زیدی متوفی ۵۷۵ھ نے قائم کیا تھا۔

اس مسجد اور اس کے کتب خانے کی تعمیر کا قصہ کورکیس عواد کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ عضدالدولہ محمد خلیفہ مستنصر بامراللہ کا وزیر تھا، ایک دفعہ اس کو منصب وزارت سے برطرف کردیا گیا، پھر اس کا منصب بحال کردیا گیا، اس وقت اس نے خلیفہ مستنصر کی خدمت میں ایک رقعہ لکھا، جس میں تحریر تھا کہ:

> ''میں نے نذر مانی تھی کہ اگر میں دوبارہ وزارت کے منصب پر بحال ہوگیا تو شریف زیدی کی خدمت میں ایک ہزار اشرفی پیش کروں گا، اس پر خلیفہ نے وزیر کو لکھا کہ میں بھی ایک ہزار اشرفی حاضر کروں گا، اس طرح دو ہزار اشرفیاں ان کی خدمت میں لے جائی گئیں، لیکن شریف نے اس میں کوئی تصرف نہیں کیا، بلکہ اس نے درب الدینار خورد میں ایک مکان خریدا، اور اس کو مسجد بنادیا، اور ان اشرفیوں میں سے جو باقی بچی تھیں، ان سے کتابیں خریدیں، اور لوگوں کے استفادہ کے لیے ان کو مسجد پر وقف کردیا، بعد میں زیدی

(۱) معجم البلدان: ۳۵/۸ (۲) معجم البلدان: ۱۷۴/۱۱
(۳) ابن الفوطی: الحوادث الجامعۃ: ۴

نے اپنی وفات سے پہلے اپنی تمام کتابیں بھی اسی مسجد پر وقف کردیں، زیدی کے ساتھ ان کے دوست صبیح بن عبداللہ نے بھی اپنی کتابیں وقف کیں، ان کی کتابیں بہت تھیں، اور لوگوں نے ان سے بہت فائدہ اٹھایا''۔(۱)

یہ کتب خانہ دواور عطیوں سے بھی سرفراز ہوا:

ایک تو عمر بن محمد بن عبداللہ دمشقی کا کلیکشن تھا، اس کی شہرت ابوالخطاب علیمی کے نام سے تھی، وہ ایک دمشقی تاجر تھا، ایک دفعہ اس نے بغداد کا سفر کیا اور زیدی سے ملاقات کی، اور ان سے وعدہ کرلیا کہ اپنی کتابیں ان کی لائبریری کے لیے وقف کردے گا، چنانچہ جب عمر کی وفات واقع ہوگئی تو اس کے بھائی نے کتابیں بغداد روانہ کردیں، یہ کتابیں جب پہنچی ہیں، تو زیدی بھی دنیا سے جاچکے تھے، لہٰذا زیدی کے دوست صُبیح نے - جو اس وقت کتب خانے کا نگراں تھا - ان کو وصول کیا اور ان کو کتب خانے پر وقف کردیا۔

اور دوسرا کلیکشن: یاقوت حموی بغدادی متوفی ۶۲۶ھ = ۱۲۲۸ء کا تھا، اس کی طرف ابن خلکان نے یہ کہتے ہوئے اشارہ کیا ہے کہ:

''یاقوت نے اپنی کتابیں بغداد میں درب دینار کی مسجد زیدی پر وقف کردی تھیں، یاقوت نے ان کتابوں کو تاریخ کبیر کے مصنف عزالدین ابوالحسن علی بن الاثیر کے حوالے کیا، ابن الاثیر نے ان کو وہاں منتقل کیا''۔(۲)

منجملہ ان مساجد کے جو کتب خانوں پر مشتمل تھیں، جامع بصرہ کا کتب خانہ تھا، اس کی روداد یہ ہے کہ جب ۶۲۴ھ میں بصرہ کی جامع مسجد میں آگ لگی، اور اس کا بڑا حصہ زمیں بوس ہوگیا، تو ابوالمظفر باتکین بن عبداللہ رومی ناصری نے ۶۴۰ھ=۱۲۴۲ء میں مستنصر کے عہد خلافت میں اس کی ازسرنو تعمیر کی، اور کوہ اہواز سے اس کے ستونوں کے لیے پتھر منگوائے، اور مسجد کی دہلیز میں دو کمرے تعمیر کیے، ایک میں کتابیں فراہم کیں۔ اس نے تمام مدارس پر کتابیں وقف کیں، اس کے زمانے میں علم کا بہت چرچا ہوا، اس کے دربار میں علماء اور دوسرے ارباب فن دور دراز سے آتے، اور وہ ان کی دادودہش ودل جوئی کرتا۔

اسی طرح نجف میں کتب خانہ حیدریہ کا کلیکشن تھا، یہ ان قدیم کتب خانوں میں تھا، جو مرور

---

(۱) عواد کورکیس: خزائن الکتب القدیمۃ فی العراق: ۱۵۴-۱۵۵

(۲) ابن خلکان: ۳۰۸/۲

زمانہ کے ساتھ سلاطین وامراء، وزراء واغنیاء اور سربرآوردہ لوگوں کے ہدایا سے تشکیل ہوا تھا، جن میں مشہورترین عضدالدولہ بویہی تھا۔

اس کتب خانے میں مشہورترین خطاطوں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی قیمتی کتابوں اور نوادرات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔(۱)

یہ کتب خانہ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں چالیس ہزار ۴۰۰۰۰ سے زیادہ کتابوں پر مشتمل تھا، یہ آج تک باقی ہے اور اس کا کلیکشن اِس وقت پہلے سے کم ہے، اور غالبًا اس کا جامع مسجد کے ساتھ ملحق کردینا آج تک اس کے باقی رہنے کا سبب ہے، مگر اس کی افادیت کم ہوکر رہ گئی ہے، اس لیے کہ اس کے دروازے عام پڑھنے والوں کے لیے کھلے ہوئے نہیں ہیں، گزشتہ دنوں -۱۹۵۰ء میں- عصر حاضر کے ایک محقق نے اس کی زیارت کی، اور اس کی نسبت معلومات حاصل کیں، ان کا بیان ہے کہ کتب خانہ مسجد کے کمروں میں سے ایک بڑے حجرے میں واقع ہے، اور وہ پڑھنے والوں کے واسطے کھلا ہوا نہیں ہے، مشرف (نگراں) کی خاص اجازت سے اس کے اندر جانے کی اجازت دی جاتی ہے، اور عموماً اس میں مؤرخین اور قدیم ذخیروں کا شوق رکھنے والے لوگ ہی جاتے ہیں، ''کتب خانے کی کوئی فہرست نہیں ہے، الماریوں میں کتابیں بے ترتیب رکھی ہوئی ہیں۔ اور یہ عربی وفارسی کتابوں کے ایسے مجموعے پر مشتمل ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں ہے، اور جس کی بیشتر کتابیں مصنفین کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں۔

اور قرآن کریم کے نسخے تو ان کتابوں اور مجموعوں میں ہیں جو انتہائی نفیس اور حد درجہ شاندار ہیں، خوبصورت خط میں لکھے ہوئے ہیں، شاندار جلدیں بنی ہوئی ہیں، بہترین اور دلکش نقش ونگار کیا گیا ہے، اور ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو مشہور خطاطوں مثلاً یاقوت مستعصمی اور احمد تبریزی کے ہاتھوں کے کتابت شدہ ہیں، قرآنی نسخوں کے علاوہ غیر معمولی ادبی قدر وقیمت کی حامل بہت سی کتابیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں، جیسے یاقوت حموی کی ''معجم الادباء'' اور ابوحیان توحیدی کی ''التقریب''، یہ دونوں کتابیں ان کے مؤلف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں''۔(۲)

---

(۱) خزائن الكتب القديمة في العراق: ۱۳۰-۱۳۱

(۲) تاريخ التربية الإسلامية، از: احمد شلبی: ۱۰۲

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل علم کی یہ عادت ہوگئی تھی کہ اپنی کتابوں کو اپنے شہر یا محلے کی مسجد میں وقف کرنے کی وصیت کر جاتے تھے، چنانچہ وہ مسجد کے کسی خاص ذخیرے میں رکھ دی جاتی تھیں، اور وہ ذخیرہ اس عالم کے نام سے موسوم ہوجایا کرتا تھا، ان ہی اہل علم میں علی بن طاہر سلمی بھی تھے، جن کا جامع مسجد ایک حلقۂ درس لگا کرتا تھا، جس کے ایک کتب خانے میں ان کی کتابیں تھیں، اسی طرح ابن جزاء بغدادی طبیب متوفی ۴۹۳ھ = ۱۰۹۹ء نے اپنی کتابیں مسجد ابوحنیفہ پر وقف کردی تھیں، اور ابوالحسین شریف زیدی متوفی ۵۷۵ھ = ۱۱۷۹ء نے اپنی کتابیں تمام مسلمانوں کے استفادہ کے لیے مشرقی بغداد کے درب الدینار کی اس مسجد پر وقف کردی تھیں، جس میں وہ پنج وقتہ نمازوں کی امامت کیا کرتے تھے۔ جس کی نسبت اوپر لکھا بھی جاچکا ہے۔

اور ابوالخیر صبیح عبداللہ حبشی متوفی ۵۸۴ھ = ۱۱۸۸ء نے بھی اپنی کتابیں مسجد زیدی پر وقف کردی تھیں، نیز اسی مسجد پر ابوالخطاب علیمی دمشقی متوفی ۵۷۴ھ = ۱۱۷۸ء اور یاقوت حموی بغدادی متوفی ۶۲۶ھ = ۱۲۲۸ء نے اپنی اپنی کتابیں وقف کی تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ اس زمانے کی ایک عام عادت اور معمول کی بات تھی، حتی کہ بعض سلاطین وامراء، علماء وادباء اور اہل ثروت افراد حتی کہ متوسط الحال اشخاص بھی مسجدوں پر بہت سی چیزیں وقف کردیا کرتے تھے، اور محض ثواب کی نیت سے کیا کرتے تھے، لیکن ہمارے پیش نظر اس وقت صرف کتابوں کا تذکرہ کرنا ہے نہ کہ دوسری اشیاء کا۔

☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ٦٧ کا بقیہ

اور اس کی خطرناک باتوں پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ عمومی اور مدارس ومساجد اور یونیورسٹیوں کے کتب خانوں سے اس کو محفوظ رکھا جائے گا، بلکہ اس کی جعل سازی، دسیسہ کاری، دانستہ غلط بیانی اور عیسائیت کی اشاعت کی وجہ سے بازاروں میں اس کی خرید وفروخت پر بھی پابندی عائد کردی جائے گی۔

واللہ من وراء القصد...... إنه نعم المولی ونعم النصیر.

المنجد فی اللغة و الأعلام

کے متعلق کچھ صاف باتیں

تحریر: محمد بن احمد الصالح　　　ترجمہ: مسعود احمد الاعظمی

[مجلة البحوث الإسلامية کے شمارہ نمبر ۴۶، شائع شدہ ۱۴۱۶ھ کی ورق گردانی کر رہا تھا، کہ اس کے ایک مضمون کے عنوان پر نگاہ ٹک گئی، عنوان تھا: **تقرير عن المنجد في اللغة و الأعلام**. مضمون کو پڑھنے کے بعد خیال ہوا کہ اس کا ترجمہ کر کے اگر اردو خواں طبقے اور ہندوستان کے علمی حلقوں کو بھی اس سے روشناس کرا دیا جائے، تو جس مقصد کے لیے وہ لکھا گیا ہے، اس کی افادیت کا دائرہ مزید وسیع ہو جائے گا، اسی خیال سے اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد یہ سمجھنے میں بھی دشواری نہیں ہوگی کہ عیسائی مشنریاں اپنے مذہب اور عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کے لیے کون کون سے حربے اختیار کرتی ہیں۔ مضمون اگرچہ مختصر ہے، مگر سبق آموز اور باعث درس ونصیحت ہے]

''المنجد'' عیسائیت کی دعوت وتبلیغ کرنے والی لغت کی ایک کتاب ہے، ایک عیسائی پادری لویس معلوف الیسوعی نے ۱۳۲۶ھ = ۱۹۰۸ء میں اس کو تصنیف کیا، اُس وقت یہ کتاب صرف لغت پر مشتمل تھی، ۱۳۷۶ھ = ۱۹۵۶ء میں اس کتاب میں أعلام کے حصے کا اضافہ کیا گیا، یہ اضافہ ایک دوسرے عیسائی پادری فرڈینان ٹوٹل نے کیا ہے، اور اس کی طباعت واشاعت کیتھولک پریس سے ہوئی ہے۔

اس کی ادارت کی نگرانی اور ذمہ داری ادا کرنے والے ہمیشہ عیسائی ہی رہے ہیں، اس کا جو حصہ زبان ولغت کے ساتھ خاص ہے، اس کے کار پردازوں میں سرفہرست: کرم بستانی، عیسائیوں کے مذہبی پیشوا پولس موترو، عادل انبوبا، اور انٹونی نعمت ہیں۔

اور جو حصہ اعلام کے ساتھ مخصوص ہے، اس میں حصہ لینے والے: پولس براورز، سلیم رکاش، لویس عجیل اور بیشال مراد ہیں، یہ لغت بہت پھیلا اور مشہور ہوا، اور تیس سے زیادہ اس کے اڈیشن نکلے، اور اس کا اختصار کر کے کچھ دوسرے لغت بھی تیار کیے گئے، جو حسب ذیل ہیں:

ا:- **المنجد الأبجدي**:١٣٨٨ھ=١٩٦٨ء

٢:- **منجد الطلاب**:١٣٨٨ھ=١٩٦٨ء

٣:- **المنجد الإعدادي**:١٣٨٩ھ=١٩٦٩ء

٤:- **المنجد المصور للأطفال.**

اس لغت کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی؛ یونیورسٹیوں، مدرسوں، اسکولوں اور عام کتب خانوں میں اس کا سکہ چلنے لگا؛ قیمت کی کمی، طباعت کی عمدگی، تصویروں، نقشوں اور دیگر تفصیلات سے آراستگی، اور اس میں درج شدہ معلومات تک بآسانی رسائی کی وجہ سے لوگوں میں متداول ہوگیا۔

مگر اس کی ان خوبیوں نے اس کی بہت سی سنگین اور زبردست خرابیوں پر پردہ ڈال دیا، جو اس کی لغزشوں، غلطیوں، جعل سازیوں اور فریب کاریوں میں پنہاں نظر آتی ہیں۔

قرآن کریم کی زبان اور اسلامی ثقافت سے وابستہ لوگوں کو اس لغت کی سنگینی اور اس کی غلطیوں کی کثرت کا احساس ہوا، اور اس میں جو تحریف اور فریب کاری کی گئی ہے، اس پر تنبہ ہوا، تو ان لوگوں نے اس کے رد میں کتابیں لکھیں، اور مضامین ومقالات قلم بند کیے، ان میں سے قابل ذکر درج ذیل ہیں:

ا-**كتاب عثرات المنجد في الأدب والعلوم والأعلام.** از: استاذ ابراہیم القطان۔ المنجد کی تنقید پر شائع ہونے والی کتابوں میں سب سے اہم کتاب ہے، ٦٦٤ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس میں ٢٤٣٤ فروگزاشتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ١٣٩٢ھ میں شائع ہوا تھا۔

٢-**كتاب النزعة النصرانية في قاموس المنجد.** از: ڈاکٹر ابراہیم عوض، ٥٠ صفحات پر مشتمل ہے اور ١٤١١ھ میں طائف میں طبع ہوئی ہے۔ اس کے مصنف نے **المنجد** کے اندر پائے جانے والے عیسائی فکر ورجحان کو اجاگر کرنے پر توجہ مرکوز کی ہے، اور ٥٠ صفحات کو متعدد ایسی مثالوں سے بھر دیا ہے، جو مسیحی رجحان کی آئینہ دار ہیں۔

۳-استاذ منیر عمادی کا سلسلۂ مضامین جو دمشق کے **مجلة المجمع اللغة العربية** میں شائع ہوا ہے۔

۴-علامۂ مغرب شیخ عبداللہ کنون کا مجموعۂ مقالات جو مجلّہ دعوۃ الحق میں شائع کیا گیا ہے۔

منجد کی خطرناک خرابیاں:

سطور ذیل میں پہلے اس لغت کی بدترین خرابیوں کا ایک عمومی اور سرسری تجزیہ کیا جا رہا ہے، بعد ازاں اس کی غلطیوں اور دسیسہ کاریوں کی متعدد مثالیں پیش کی جائیں گی۔اس کی بدترین خرابیاں یہ ہیں:

اولاً: اس میں ہر جگہ اور موقع بے موقع عیسائی مذہب کو اجاگر کرنے کی ہوس نظر آتی ہے، عیسائی مذہب اور اس کے رسم و رواج اور تقریبات سے متعلق مفصل معلومات دی جاتی ہیں۔

عیسائیت کی روح کا سب سے پہلا جو عکس اس میں نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے،اور جب صفحہ ۳۸ پر ''بسمل'' کے مادہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں ''**بســـــم الأب والابن وروح القدس**'' اسلامی شریعت کے صیغۂ ''**بسم اللّٰه الرحمن الرحيم**'' سے پہلے لکھا ہوا ملتا ہے۔

ثانیاً: اسلامی عقیدے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، یا اس کے متعلق غلط یا پُر فریب معلومات دی گئی ہیں۔

ثالثاً: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کی سیرت مبارکہ وطیبہ سے چشم پوشی کی گئی ہے، سیرت اور اس کی کتابوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے، اور نہ اس کے لیے کوئی مادہ خاص کیا گیا ہے۔

رابعاً: بہت سی اہم اور عظیم المرتبت اسلامی شخصیتوں سے صرفِ نظر کیا گیا ہے، اور عیسائی اور یورپی شخصیتوں پر توجہ صرف کی گئی ہے۔

خامساً: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' اور کسی بھی صحابی کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' نہیں لکھا گیا ہے۔

سادساً: اس لغت میں لفظ ''قرآن'' کے ساتھ کہیں بھی ''**الكريم**'' یا ''**المجيد**'' نہیں لکھا گیا ہے، جب کہ یہودی یا عیسائی مذہب کی کتاب کے ساتھ ہر جگہ **الــكتــاب الـمـقـدس** یا

الأسفار المقدسة لکھا گیا ہے۔

سابعاً: اسلام کے اصلی اور بنیادی مآخذ اور مراجع کی طرف مراجعت نہ کر کے مسیحی مآخذ پر اعتماد کیا گیا ہے۔ یہ رجحان عبادات کی تعریف اور انبیاء اور پیغمبروں وغیرہ کے تعارف میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

ثامناً: کئی ناموں میں تحریف اور تاریخ میں غلطی ہوئی ہے۔ اور حقائق کو اس طرح مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے جس سے مذہب عیسائیت کو قوت پہنچتی ہے۔

تاسعاً: بہت سی تصویریں وضع کر کے اس میں شامل کی گئی ہیں، منجملہ ان کے وہ تصویر ہے جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم کی تصویر کہا گیا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۵۱۲ میں مرد و عورت کی ایک برہنہ اور روتی ہوئی تصویر درج ہے، اور اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تصویر آدم و حواء کی اس وقت کی ہے جب وہ جنت سے نکالے گئے تھے۔

منجد کی چند مثالیں:

۱- لغت والے حصے میں صفحہ ۶۱۶ پر ''قرأ'' کے مادہ کے تحت ''القرآن'' کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ ''مصدر ہے'' اور قرآن کریم کی جانب ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا گیا ہے۔

۲- یہی بات صفحہ ۲۳۶ پر ''ذکر'' کے مادہ میں بھی ہے، لفظ ''ذکر'' کو مصدر تو لکھا ہے، لیکن اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے کہ وہ قرآن کریم کا اسم علم ہے۔

۳- صفحہ ۶۷۱ پر کتب کے مادہ لفظ ''الکتاب'' کے تحت اشارے کنائے میں بھی یہ بات نہیں لکھی کہ یہ لفظ قرآن کریم کے لیے استعمال کیے جانے والے ناموں میں سے ایک ہے۔

۴- صفحہ ۴۱۷ پر ''صحف'' کے مادہ میں جب ''مصحف'' تک پہنچا ہے، تو صرف اس کا عمومی معنی درج کیا ہے، اور یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ ان صحیفوں کے لیے اسم علم کے طور پر بولا جاتا ہے، جس میں قرآن کریم جمع کیا گیا ہو اور جس کی تعبیر ''مصحف'' سے کی جاتی ہے۔

۵- شخصیات (مثلاً گزشتہ پیغمبروں) کے ذکر میں اس لغت کے اندر انجیل پر- جس کو وہ لوگ کتاب مقدس کہتے ہیں- اعتماد کیا ہے، اور مصنف نے اپنی خواہش کے مطابق اس میں کمی بیشی کی ہے، اگرچہ کبھی کبھی ملمع کاری کے لیے کہتا ہے کہ ان کا قرآن میں ذکر ہے، جس سے پڑھنے والے کو یہ

غلط فہمی ہوگی کہ جس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے، اس کا مرجع قرآن ہے۔

اس کی مثال حضرت حواء پر اس کا یہ تہمت لگانا ہے کہ انھوں نے ہی حضرت آدم کو گمراہ کیا (ص ۲۲۶ر قسم اعلام) اسی طرح اس نے لکھا ہے کہ جب آدم وحواء جنت الفردوس سے نکالے گئے، تو ان سے ایک نجات دہندہ کا وعدہ کیا گیا جو کہ مسیح ہیں (۳۱ر اعلام)۔

۶- حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر اولین رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں کیا ہے، بلکہ توریت کی شخصیات میں سب سے قدیم شخصیت کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے (۵۷۹ر اعلام)، اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام کو پیغمبر نہ لکھ کر ان کو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادہ (بھتیجا) کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، (۴۹۷ر اعلام)۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا پیغمبر ہونا ذکر نہ کر کے ان کو حکیم کی صفت کے ساتھ ذکر کیا ہے (۳۰۷ر اعلام) اور اس کے برعکس حضرت لقمان کو پیغمبر لکھا ہے، اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ قرآن میں ان کے نام سے ایک سورت مخصوص کر دی گئی ہے (۵۷۹ر اعلام)

۷- اس لغت میں-عہد قدیم کی موافقت میں-حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ تہمت لگائی گئی ہے کہ انھوں نے اپنے سپہ سالار اوریا کی بیوی سے شادی کرنے کے لیے اس کو قتل کرا دیا (ص ۲۴۰، ۵۶۸ر اعلام) اور یہ نہایت گھناؤنا اور کافرانہ بہتان ہے۔

۸- ہاروت و ماروت کے مادہ میں لکھا ہے کہ وہ دو جادوگر تھے، جن کو آزمائش میں ڈالا گیا، پھر اللہ نے ان کو مبتلائے عذاب کیا، اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن میں ان دونوں کا ذکر ہے (۵۸۹ر اعلام)۔ اس میں کذب وجعل سازی اور افتراء وغلط بیانی کے ساتھ ساتھ قرآن کی مخالفت بھی ہے۔

۹- اصحاب کہف پر کلام کرتے وقت لکھا ہے کہ وہ لوگ اتنی گہری نیند سوئے کہ دوسو سال سے پہلے بیدار نہیں ہوئے، اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا ذکر قرآن میں بھی ہے (۵۲ر اعلام)۔ اس سے پڑھنے والے کو یہ فریب دینا مقصد ہے کہ قرآن کریم میں اصحاب کہف کی نسبت یہی بات بیان کی گئی ہے، حالانکہ قرآن کریم کا بیان اس سے یکسر مختلف ہے۔

۱۰- ''شھـــد'' کے مادہ میں شہادت کے کئی معنی ذکر کیے ہیں، لیکن شہادتین کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ شہادتین کے کلمے اسلام کا اولین رکن ہیں۔ اور یہودیوں کے ''قبۂ شہادت'' کا بڑے شوق سے

ذکر کیا ہے۔(دیکھئے صفحہ ۶۰۴ مادۂ قبہ)۔

۱۱-صفحہ ۴۹۰ میں عورت کی عدت کی تعریف میں لکھا ہے کہ عدت: ''شوہر کے (مرنے پر اس کے) سوگ کے دنوں کو کہتے ہیں''۔ یہ عبارت عدت کے صحیح فقہی معنی کو ادا نہیں کرتی۔

۱۲-عیسائیوں اور یہودیوں کے تہواروں کا بہت اہتمام سے ذکر کیا ہے، اور ان کے اوقات اور منانے کے طریقوں کو بیان کیا ہے، لیکن مسلمانوں کی جو دو عید ہے، اس کی نسبت اس کا رویہ مختلف ہے، چنانچہ صفحہ ۵۸۸ پر **فطر** کے مادہ میں عید الفطر کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ رمضان کے بعد مسلمانوں کی عید ہے''۔ اور عید الاضحیٰ کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ ''وہ یوم النحر (قربانی کا دن) ہے''۔

۱۳-اس لغت کو قلم بند کرنے والے اس بات کے حریص نظر آتے ہیں کہ پڑھنے والے پر عیسائی ذوق طاری کردیں، وہ ذوق جس کی تشکیل میں مختلف عوامل کارفرما ہیں، ان عوامل میں سرفہرست اس کی منسوخ شریعت ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۹۷ پر ''خنزیر البر'' (خشکی کا خنزیر) کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ''خنزیر کے مشابہ ایک جانور ہے، لیکن وہ اس سے (خنزیر سے) مختلف ہوتا ہے، خاص طور سے دانت اور شکل میں، اور اس کا گوشت خوش ذائقہ ہوتا ہے''۔

۱۴-اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ صفحہ ۹۱۸ پر ''**الناطل**'' کے لفظ کی تشریح میں لکھا ہے کہ ''ایک پیالہ ہوتا ہے، جس میں شراب اور دودھ جیسی چیزیں تولی جاتی ہیں''۔

اسی طرح صفحہ ۶۱ پر ''**التریاقة**'' کا معنی یہ بیان کرتا ہے کہ ''شراب ہوتی ہے، اس کا نام تریاق اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ رنج وغم کو دور کرتی ہے''۔

۱۵-اسی روش پر چلتے ہوئے اُس کو صفحہ ۴۲۲ پر لفظ ''**الصرد**'' کی تشریح میں اِس کے علاوہ اور کوئی جملہ نہیں ملتا کہ ''**سقاه خمراً صرداً**''، یعنی اس کو خالص شراب پلائی۔

اور صفحہ ۴ پر ''**اتحد**'' کے لیے جو مثال دی ہے وہ یہ ہے: ''**اتحد الماء بالخمر**''. پانی شراب کے ساتھ (مل کر) ایک ہوگیا۔

۱۶-صفحہ ۲۳۶ پر ''خیبر'' کے ذکر میں لکھا ہے کہ: نبی نے اس پر حملہ کیا، اور اس کے یہودی باشندوں پر ٹیکس مقرر کیا۔ اس توضیح میں ثابت شدہ تاریخی حقائق کو مسخ کرکے اور بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے۔

ان ہی چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے اس لغت کی غلطیوں بقیہ صفحہ ۶۱ پر

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ
(مکاتیب حضرت مولانا منظور نعمانیؒ)

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

اس رسالہ کے صفحات پر اب تک بہت سے اہل علم کے خطوط طبع ہو چکے ہیں، اس شمارہ سے حضرت علامہ اعظمیؒ کے ابتدائی دور کے شاگرد، عظیم عالم اور بلند پایہ مصنف حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے مکاتیب شائع کیے جارہے ہیں، جو انھوں نے اپنے استاذ حضرت محدث اعظمیؒ کی خدمت میں ارسال کیے تھے، مولانا نعمانی کے خطوط کافی تعداد میں ہیں، اور امید ہے کہ کئی قسطوں میں پورے ہوں گے، سر دست پہلی قسط پیش خدمت ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی ۱۸/شوال ۱۳۲۳ھ = ۱۶/دسمبر ۱۹۰۵ء کو سنبھل میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن سنبھل اور دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں حاصل کی، ۱۳۴۰ھ میں مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی - متوفی ۱۳۶۱ھ - مدرس ہو کر دارالعلوم مئو تشریف لائے، تو مولانا نعمانیؒ بھی ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر آئے، یہیں انھوں نے علامہ اعظمیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہوئے ان سے متعدد کتابوں کا درس لیا، دارالعلوم مئو میں ان کی مدت تعلیم تقریباً ۳/سال رہی، اس کے بعد دیوبند گئے، اور ۱۳۴۵ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے فاتحۂ فراغ پڑھی۔

فراغت کے بعد اپنے وطن میں مدرسہ محمدیہ سے درس و تدریس کا آغاز کیا، ایک سال بعد امروہہ چلے گئے اور وہاں کے مدرسہ اسلامیہ چلّہ میں درس و افادہ کا کام انجام دیا۔ تین سال کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ موقوف کر دیا، پھر کہیں باقاعدہ مدرسی نہیں کی، سوائے ندوۃ العلماء میں چند سالہ تدریس حدیث کے۔

مشغلۂ درس و تدریس سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے دین و مذہب کی خدمت کے لیے ایک دوسرا میدان اختیار کیا، یہ میدان تھا اہل سنت کی حمایت اور اہل ہویٰ و بدعت کے رد و ابطال کا۔ اس میں انھوں نے اپنی تمام علمی، قلمی اور لسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ان کا سب سے اہم کارنامہ ماہنامہ ''الفرقان'' کا اجراء تھا، جسے انھوں نے محرم ۱۳۵۳ھ = مئی ۱۹۳۴ء میں بریلی سے جاری کیا، جو بعد میں منتقل ہو کر لکھنؤ آ گیا، انھوں نے اس میں ایسی روح پھونکی کہ بہت جلد وہ

ہندوستان کے کامیاب اور بلندترین علمی رسائل میں شمار ہونے لگا۔

مولانا کو تصنیف وتالیف میں بھی کمال اور غیر معمولی ملکہ حاصل تھا، آپ کی تصانیف زبان وبیان کی سلاست وشستگی اور علمی وفکری پختگی کے لحاظ سے ممتاز ہوتی ہیں، تصنیفات کی تعداد بہت ہے، ان میں معارف الحدیث، ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت، اور بوارق الغیب وغیرہ نمایاں شہرت کی حامل ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے حضرت مولانا نعمانی، محدث کبیر وجلیل حضرت مولانا اعظمیؒ کے شاگرد تھے، اوران سے متعدد کتابیں پڑھی تھیں، وہ اپنے استاذ سے حد درجہ عقیدت ومحبت اور بغایت تعلق رکھتے تھے، جولائی ۱۹۸۷ء میں راقم کو چند دفعہ حضرت مولانا نعمانی کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے، اس وقت آپ صاحب فراش تھے اور عام طور پر کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے، لیکن حضرت علامہ اعظمیؒ کی شاگردی کے تعلق سے احقر کو ملاقات کی اجازت مرحمت فرمائی، مولانا کی علالت کی وجہ سے میں جلدی واپس ہونا چاہتا تھا، لیکن از راہ شفقت کافی دیر تک پاس بٹھائے رکھا، جب تک رہا اپنے استاذ حضرت اعظمیؒ کا ہی ذکر خیر کرتے رہے، پرسش احوال اور مشغولیات کی تفصیل معلوم کرتے رہے، اس وقت مولانا نے کئی ایک کتابوں کا نام لیا جو انھوں نے حضرت محدث الاعظمیؒ سے پڑھی تھیں، ساری کتابوں کا نام تو اب یاد نہیں، لیکن ''حسامی'' کا یاد آرہا ہے، اور یہ بھی کہ میں نے تحریر وانشاء کی مشق بھی مولانا ہی سے کی ہے۔

مولانا نعمانیؒ کو اپنے استاذ حضرت محدث الاعظمیؒ سے جو گہرا اور نیازمندانہ تعلق تھا، اس کا اندازہ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کی اس تحریر سے ہوسکتا ہے، مفتی صاحب نے لکھا ہے:

''ایک دن میرے کمرہ پر کسی ممبر کو ڈھونڈ ھتے ہوئے تشریف لے آئے اور داخل ہوکر دروازہ کھول کر کھڑے ہوگئے، اور فرمایا: مولوی ظفیر! میں مفتاحی تو نہیں ہوں، مگر حبیبی تو ہوں۔ یعنی ہمارا رشتہ استاذ بھائی ہونے کا ہے''۔ (المآثر ج ۶ ش ۳ ص ۵۰)

مفتی صاحب نے اپنے اسی مضمون میں آگے تحریر فرمایا ہے:

''یہ واقعہ ہے کہ مولانا کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ تعلق تھا، اور حضرت کشمیری کے بعد علم حدیث میں ان پر پورا اعتماد تھا، اور کوئی مسئلہ آتا تو آپ کی طرف رجوع فرماتے''۔

اس والہانہ تعلق کا اندازہ ان خطوط سے بھی ہوگا، جن کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے، ان خطوط سے جہاں بہت سی علمی باتوں اور تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے، وہیں یہ بھی اندازہ ہوگا کہ مولانا نعمانیؒ کو حضرت اعظمیؒ

سے کس قدر عقیدت اور آپ کے علم پر کتنا اعتماد تھا کہ جب کسی اہم اور مشکل بحث پر کچھ لکھنے کا مسئلہ ہوتا تو آپ کے علاوہ اور کسی کی طرف ان کی نگاہ نہ اٹھتی، اور دوسری طرف استاذ کا اس قدر لحاظ اور خیال تھا کہ جب حالت و کیفیت اور خیریت مزاج دریافت کرنی ہوتی تو عموماً خط میں یہ لکھتے کہ آپ زحمت نہ فرمائیں، مولانا عبدالجبار صاحب سے فرمادیں کہ چند سطریں لکھ دیں، یا لکھتے کہ مولوی رشید احمد صاحب سے کہہ کر چند سطریں لکھوا دیں۔

۲۶؍ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ = ۴؍مئی ۱۹۹۷ء کو مولانا نعمانی کی وفات ہوئی۔

....

مخدومی ومطاعی! متعنا اللہ بطول بقائہم

سلام مسنون۔ غازی پور آیا اور افسوس ہے کہ ملاقات سے محروم جا رہا ہوں، عریضہ کا جواب اولین فرصت میں بریلی ارسال فرمایا جائے۔

الفرقان کے قدیم خریداروں کو باقی رکھنے کے لیے محرم میں سالگرہ نمبر نکالنے کا ارادہ کرلیا ہے اور ذیقعدہ کے نمبر میں اعلان بھی ہوگیا ہے، انشاء اللہ محرم کے پہلے ہفتہ میں بلکہ حتی الوسع ۲-۳ محرم کو قریباً دوسو صفحات پر شائع ہوگا اور ابھی تک ایک سطر نہیں لکھی گئی ہے، میں اس وقت مضمون کا اتنا محتاج ہوں کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، اس لیے آج یہ تکلیف دینے پر مجبور ہوں کہ ہفتہ عشرہ کے اندر اندر مضمون ارسال فرمایا جائے۔ توقع ہے کہ از راہ ترحم اس وقت محروم نہ کیا جاؤں گا۔ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب سے بھی فرمادیا جائے، وقت نہیں ہے ورنہ اسی وقت ان کو بھی عریضہ لکھتا والسلام۔

محمد منظور نعمانی غفرلہ

مخدومی ومحترمی حضرت مولانا عبداللطیف صاحب! زیدمجدہم (۱)

سلام مسنون۔ الفرقان کے سال گرہ نمبر کے لیے زائد از زائد ۵ ذی الحجہ تک کوئی مضمون تیار فرما کر ارسال فرمائیے، موضوع کی کوئی تخصیص نہیں، لیکن محرم پر نہ ہو، کیونکہ اس کے متعلق دوسرے بعض حضرات کو لکھ چکا ہوں والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۸؍فروری ۳۶ء

(۱) حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی رحمۃ اللہ کے نام یہ مکتوب اوپر والے مکتوب کی پشت پر تحریر تھا۔

حضرت محترم! سلام مسنون۔
مضمون کا شدید انتظار ہے۔
میں جمعہ کے دن گیا سے بعافیت بریلی پہنچ گیا[1]۔آپ کے تشریف لانے کے بعد دو تقریریں خاص ان کے مرکزوں میں ہوئیں، وللہ الحمد۔افسوس وقت میں گنجائش نہ تھی، ورنہ گیا کی فضا اس وقت کام کرنے کے قابل تھی، والسلام۔
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

حضرت محترم!
سلام مسنون۔
شعبان میں الفرقان کا شہید نمبر نکالنے کا ارادہ ہے اور متوکلاً علی اللہ اعلان بھی کر دیا گیا ہے، اس کا ایک اشتہار ہمرشتہ عریضۂ ہذا ارسال خدمت بھی ہے، وقت بے حد تنگ ہے، بظاہر اسباب صرف آپ جیسے حضرات کی اعانت پر بھروسہ ہے، لہذا جس قدر ممکن ہو اُس کے لیے کوئی مناسب مضمون ارسال فرمائیں، اگر فوراً نہیں تو رجب کے پہلے ہفتہ میں مضمون ضرور آجانا چاہئے۔کسی خاص امید پر یہ عریضہ لکھ رہا ہوں، توقع ہے کہ میری امید غلط نہ ہوگی، مکرر آنکہ وقت بہت کم ہے، اس کے بعد شاید میں یاد دہانی بھی نہ کرسکوں، بس ابھی سے مضمون کا منتظر ہوں، اگر فوراً مضمون نہ بھیجا جا سکے تو کم از کم اطمینان خاطر کے لیے اتنا ضرور تحریر فرما دیجئے کہ فلاں وقت تک مضمون پہنچ جائے گا، اشتہار ملاحظہ فرما کر مضمون کے لیے موضوع کا انتخاب جناب خود فرمالیں، والسلام۔
المکلّف محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان- بریلی

۳۶/۹/۷ء

یہ عریضہ صرف ضابطہ کا نہیں ہے بلکہ شدید ضرورت ہے، یہ ضروری نہیں کہ مضمون شہیدؒ کی سیرت ہی کے متعلق ہو، بلکہ جو بھی ہو سکے۔

---

(۱) فروری ۱۹۳۶ء کے اواخر میں گیا میں رضا خانیوں سے مناظرہ ہوا تھا، اس مناظرے میں اہل دیوبند کی طرف سے حضرت محدث الاعظمیؒ اور مولانا نعمانیؒ دونوں بزرگ شریک ہوئے تھے۔

حضرت محترم! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

میں نے حسب الحکم رسڑا والوں سے وعدہ کرلیا تھا اور غالباً ۱۴رجون کو وہاں پہنچنا ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔ واپسی میں کچھ دیر کے لیے حاضر خدمت بھی ہوں گا، اگر رسڑا میں شرف ملاقات سے محرومی رہی۔

یہ عریضہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ مناظرہ ادری (۱) کے بعد سے جتنی دفعہ میں مئو حاضر ہوا، ادری کے احباب بلانے کے لیے آئے اور میں کبھی تھوڑے سے تھوڑے وقت کے لیے بھی نہ جاسکا اور ہمیشہ شرمندگی کے ساتھ عذر کر دیا۔ لیکن اب خیال ہے کہ اس سفر میں ان کا قرض ادا کردوں اور رسڑا سے واپسی میں ایک رات ان کو بھی دے دوں۔ مگر مجھے ان لوگوں میں سے کسی کا نام یاد نہیں رہا، جو مجھے بار بار مئو لینے کے لیے آئے، پس اگر ان صاحبان میں سے کسی سے ملاقات ہوجائے یا بآسانی ان کو اطلاع دی جاسکے تو ان کو مطلع فرمادیا جائے کہ وہ اگر چاہیں تو ۱۴-۱۵ جون کو رسڑا میں مجھ سے ملاقات کرلیں، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۵ ربیع الاول ۵۶ھ

یاد آیا، ہمارے دوست مولوی محمد صاحب بھی ان لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے مجھ سے ادری جانے کے لیے کئی بار کہا تھا، لہٰذا بہتر ہو کہ انھی کو اس کی اطلاع دے دی جائے فقط والسلام۔

....

حضرت مخدومی ومحترمی!

سلام مسنون۔

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔

(۱) ۱۳۵۲ھ=۱۹۳۳ء قصبہ ادری میں رضا خانیوں سے ایک فیصلہ کن مناظرہ ہوا تھا، اس کے بارے میں مولانا نظام الدین اسیر ادروی نے ترجمان الاسلام (شمارہ ۱۳، ص ۳۱) میں لکھا ہے: ''۱۳۵۲ھ میں قصبہ ادری ضلع اعظم گڈھ کے ہنگامہ خیز مناظرہ نے پورے ضلع کو متاثر کیا، مجھے یاد ہے یہ مناظرہ مولانا اعظمی کی بروقت مداخلت اور پیش قدمی کی وجہ سے ہوا۔ اس کا آغاز مولانا عبداللطیف نعمانی نے کیا اور خاتمہ مولانا محمد منظور نعمانی نے، مولانا اعظمی بحیثیت سرپرست ہر نشست میں اسٹیج پر بروقت رہنمائی کے لیے موجود رہتے اور دلائل اور جوابات کی نشاندہی اور ہدایت کا فریضہ انجام دیتے تھے''۔

اس وقت ایک خاص ضرورت سے یہ عریضہ لکھ رہا ہوں ''سید محمد'' کا رسالہ ''التحقیق البارع'' جونپور سے برائے جواب آیا ہے اور یوں بھی اس مسئلہ پر روشنی پڑنے کی بے حد ضرورت ہے۔ میں اول تو فرصت سے محروم رہتا ہوں، پھر کتابوں کے نہ ہونے سے اور بھی مجبور رہتا ہوں۔

کوئی اور صاحب اس کے لیے سوا آنمحترم کے نظر میں نہیں، اس لیے تکلیف دیتا ہوں کہ جس طرح بھی ممکن ہو فرصت نکال کر اس کا جواب لکھ دیا جائے۔

شاید ترتیب یہ اچھی رہے کہ پہلے مسلک حق کی توضیح اور ادلہ سے اس کی تائید پیش کی جائے، پھر اس رسالہ میں جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان کے جوابات دیے جائیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ شاہ صاحب نے تحفہ میں اس پر کلام کیا ہے۔ اور حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب کی جو کتاب ردشیعہ میں ہے غالباً ''السیف المسلول'' یا اس کے مثل نام ہے، اس میں بھی یہ بحث آ گئی ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ جو احادیث اس نے پیش کی ہیں اس کا جواب یہ کافی ہوگا کہ حضورؐ کے یہ تمام احکام وتصرفات تحت حکم خداوندی تھے۔ جیسا کہ ''**ما ینطق عن الھویٰ**'' اور ''**ان اتبع الا ما یوحیٰ الیَّ**'' کا مقتضیٰ ہے۔

بس صوفیوں اور صوفی منشوں کی عبارات رہ جائیں گی، سو ان کی توجیہ اور ساتھ ہی ان کے مقابلہ میں دیگر محققین علماء کی عبارات پیش کر دی جائیں۔ بہر کیف جواب مفصل اور مکمل ہو اور اختصار کی زیادہ کوشش نہ فرمائی جائے، اور پھر یہ بھی درخواست ہے کہ بس ہفتہ دو ہفتہ میں ہو بھی جائے اور میں جانتا ہوں کہ اگر توجہ فرما دی جائے تو دو ہی چار دن میں ہو سکتا ہے۔

امید کہ رسید سے مطلع فرمایا جائے گا اور یہ کہ جواب میں کے دن لگے گا۔

بے حد مصروف ہوں، ابھی قریباً ۳۰-۴۰ خطوط اور لکھنے ہیں، نہ معلوم جلدی میں کیا کیا لکھ دیا، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ ۹/۳/۷۵ھ

پولیٹکل کانفرنس ہو چکی ہوگی۔ کیا کیا ہوا؟ اور کون کون آیا؟

محترمی! سلام مسنون۔

عرصہ سے گرامی نامہ کا انتظار ہے، شارع حقیقی کی آخری قسط بھی نہیں پہنچی اور مجدد الف ثانی نمبر کے لیے جس مضمون کے متعلق میں نے عرض کیا تھا وہ بھی نہیں، اگر لکھا جا چکا ہو تو بہت جلد ارسال فرما دیجیے، تین کاتب اس وقت کتابت میں مصروف ہیں، اگر بفرض ابھی نہ لکھا جا چکا ہو اور مصروفیت کی وجہ سے شروع بھی نہ کیا جا سکا ہو تو پھر مجبوری ہے۔

ادھر مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری نے جو مضمون بھیجا ہے، اس میں حدیث مجددیہ پر بھی بحث کی ہے، جو اگرچہ تمام اطراف و جوانب کو تو محیط نہیں ہے، پھر بھی خاصی ہے۔

مجموعۃ الفتاویٰ، مرقاۃ، درجات مرقاۃ الصعود، کی ضروری چیزیں انھوں نے سب لے لی ہیں۔

مکرر یہ کہ اگر مضمون تیار ہو، یا بہت جلد تیار ہو سکتا ہو، تو امکانی عجلت سے روانہ فرما دیا جائے۔

شارع حقیقی کی آخری قسط کا بھی انتظار ہے۔

خدا کے فضل سے مجدد نمبر کے لیے توقع سے بہت زیادہ اور بہت بہتر مضامین مل گئے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب نے قریباً پچاس صفحے کا مضمون لکھا ہے اور تقریباً اسی قدر مولوی مناظر احسن گیلانی نے، ابوالاعلیٰ صاحب لکھ رہے ہیں، انشاء اللہ نمبر بہترین شکل میں حاضر ہوگا، والسلام محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۵/۷/۵۷ھ

محشر صاحب کو میں نے نمبر ہی کی تیاری میں امداد کے لیے بلا لیا تھا اور انھوں نے کافی مدد کی، والسلام۔

از راقم السطور محشر حسینی سلام مسنون قبول باید کرد۔[1]

....

مخدومی محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

گرامی نامہ عید اضحیٰ سے پہلے موصول ہو گیا تھا، لیکن ایک خاص مصروفیت کی وجہ سے جواب آج تک نہ عرض کر سکا۔

(۱) محشر حسینی ضلع اعظم گڈھ کے قصبہ نظام آباد کے تھے، اور مولانا عبدالحمید کے چھوٹے بھائی تھے، مفتاح العلوم میں پڑھتے تھے اور حضرت محدث الاعظمیؒ کے شاگرد تھے، بہت ذہین اور زیرک تھے۔ کم عمری ہی میں انتقال کر گئے تھے۔

''اعیانِ قرنِ ثالث عشر'' کی تاریخ کا کام بہت ہی اہم اور انشاء اللہ بہت مفید ہوگا، لیکن چونکہ میں اس مذاق سے ہمیشہ محروم رہا ہوں، اس لیے خود اپنے یہاں کے اکابر کے حالات سے بھی واقفیت نہیں، مگر انشاء اللہ کوشش کرنے سے کچھ معلومات حاصل ہو ہی جائیں گے۔

''رجال بخاری'' کا جواب بھی ضروری ہے[1]۔ اس کی صورت تو یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس کا ضروری مواد آپ دارالمبلغین والوں کو دیدیں اور وہاں مولوی عبدالسلام صاحب یا کوئی اور صاحب اس کو مرتب کردیں۔

''شارع حقیقی'' کا ٹائیٹل انشاء اللہ محرم میں تیار ہوجائے گا اور حسب الحکم پچیس نسخے بھیج دیے جائیں گے، اگر زیادہ مطلوب ہوں تو بے تکلف تحریر فرمادیا جائے، قیمت کا کیا ذکر ہے۔

....

اس گرامی نامہ کے ورود سے پہلے تازہ پرچہ کے نگاہ اولین میں میں ناظرین الفرقان سے وعدہ کرچکا ہوں کہ آئندہ انشاء اللہ حضرت مولانا کا مضمون ''نذر لغیر اللہ'' کے موضوع پر شائع ہوگا، جو اس مسئلہ پر گویا فیصلہ کن ہوگا، اور یہ چھپ بھی چکا ہے، ملاحظہ سے گذرے گا، اب تو مجبوری ہے اور جس طرح بھی ہو اس کے لیے تو وقت نکالنا ہی پڑے گا، اسی لئے ایک رسالہ ارشاد الحق بھیج رہا ہوں، اس موضوع پر مخالف نقطۂ نظر سے جامع ترین رسالہ ہے۔ فاضل بریلوی کے رسالے ''سبل الاصفیاء فی حکم الذبح للاولیاء'' کی قلمی نقل ارسال خدمت کرنے کے لیے کرائی تھی جس کو قریباً ایک مہینہ ہوگیا، لیکن اس وقت وہ گم ہے اس لیے نہیں مل سکی۔ لیکن اُس کا مواد رسالہ ''ارشاد الحق'' میں آگیا ہے، اگر مناسب سمجھا جائے تو رسالہ کے جواب کا پیرایہ اختیار کرلیا جائے، یا ایسا ہو کہ رسالہ کو پیش نظر پہلے سوال مرتب کرلیا جائے اور بس اس کا جواب لکھ دیا جائے اور براہ راست کسی تحریر سے تعرض نہ ہو، غالبًا یہی مناسب رہے گا اور اسی میں سہولت ہوگی۔

اس مسئلہ کے متعلق اپنی طرف سے ابھی تک کوئی شافی چیز نہیں لکھی گئی ہے۔

مولانا تھانوی کے فتاویٰ میں متفرق طور پر اس پر بحث ہے جس کو اگر جمع کرلیا جائے تو غالبًا

---

(۱) مرزا عبدالحسین نامی کسی شیعہ نے ''رجال بخای'' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر صحیح بخاری کے راویوں پر اعتراض کیا تھا، حضرت محدث الاعظمیؒ نے اس کا نہایت دندان شکن اور مدلّل جواب تحریر فرمایا تھا۔ حضرت محدث الاعظمیؒ کی تصنیف آپ کے اوراق میں محفوظ تھی، اور ۱۴۲۳ھ=۲۰۰۲ء میں ''تعدیل رجال بخاری'' کے نام سے شائع ہوئی ہے،

بہت کافی ہوگا۔

مکرر یہ کہ یہ کام تو اس وقت کرنا ہی ہوگا۔

کیا دہلی کے اجلاس میں تشریف آوری کا خیال ہے؟ اگر موقع ہو تو ضرور تشریف لایئے،

والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۵۷/۱۲/۱۸ھ

....

حضرت مخدومی محترمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

آج اور اسی وقت گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، نذر والے مضمون کے متعلق یاد دہانی کی ضرورت بھی تھی اور خیال بھی کئی دفعہ آیا مگر پھر بالقصد نہ لکھا۔ یہاں تک کہ میرے ایک دوست مولوی حکیم عبدالحمید بیگ بریلوی کل ہی میرے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہیے! نذر کے متعلق وہ حضرت مولانا اعظمی کا مضمون تو اب تک شائع نہیں ہوا۔ میں نے کہا ایک خاص خیال سے اب تک میں نے مولانا کو یاد دہانی بھی نہیں کی، انھوں نے فرمایا کہ اچھا تو نذر کے مسئلہ کے متعلق میرے کچھ خاص شبہات ہیں، میں مولانا کو بھیج دوں کہ وہ اپنے مضمون میں ان کی طرف بھی توجہ فرمالیں۔ میں نے کہا ضرور، مضمون مکمل ہوجائے گا۔ چنانچہ وہ مجھ سے پتہ بھی لے گئے اور شاید جلدی ہی خط لکھیں گے۔ بہر حال اب جب کہ رجال بخاری سے فراغت ہو رہی ہے اُس مسئلہ کو بھی مسئلہ ''تشریع'' کی طرح صاف فرمادیجئے۔ مسئلہ وہ بھی علمی ہے اور ہر ایک کے بس کا نہیں ہے۔ خود مجھے بھی اس میں الجھنیں ہیں۔

رجال بخاری کی طباعت کا انتظام یہاں ہوسکتا ہے چھوٹی تقطیع (۲۰×۳۰/۱۶) کا تخمینہ یہ ہے: کتابت (اڑھائی روپے) طباعت (اڑھائی روپے) کاغذ جیسا لگایا جائے اگر گلیز اچھا لگایا جائے تو چوبیس پونڈ کا بہتر رہے گا اور ۲۸ پونڈ کا اور بہتر، دونوں کی قیمت فی رم علی الترتیب (۴ روپے ۱۲ آنے، ۵ روپے ۱۲ آنے) قریباً ہوگی، گویا ایک ہزار طباعت کی صورت میں فی جز قریباً دس روپے اچھے گلیز پر لاگت آئے گی۔ پانچ سو میں کاغذ اس کا نصف اور طباعت میں بھی کچھ کمی ہوجائے گی۔

شارع حقیقی کی تکمیل کو کئی مہینے ہوگئے، لیکن میرے یہاں کے کارکن حضرات مجھ سے بھی

زیادہ چست ہیں کہ ابھی تک نہ ٹائٹل تیار ہوا ہے نہ کتاب ہی تیار ہوئی ہے، گویا ابھی ہر فرمہ علیٰحدہ ہی رکھا ہے۔اس ندامت کی وجہ سے میں نے نذر والے مضمون کے لیے یاد دہانی بھی نہیں کی۔ میں نے آج کہہ دیا ہے کہ حتی الوسع اس ہفتہ میں اس کا ٹائٹل تیار کرالیا جائے اور پچیس نسخے مئو روانہ کردیے جائیں، خدا کرے کہ ایسا ہی ہوجائے۔ ورنہ اگر زیادہ دیر ہوتی دیکھوں گا تو پھر بلا ٹائٹل ہی نسخے ارسال خدمت کرادیے جائیں گے۔ایک نسخہ بلا ٹائٹل نمونۃً پیکٹ کی شکل میں اس عریضہ کے ساتھ ہی روانہ کرارہا ہوں والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ ۲۹/۷/۳۹

....

بریلی

مخدومی ومحترمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

''شارع حقیقی'' ٹائیٹل لگ کر اور کٹ کٹا کر کل ہی تیار ہوسکی ہے، آج اس کے پچیس نسخے (۲۰ گلیز والے اور ۵ رف والے) ارسال کردیے گئے ہیں، بلٹی آج ہی مرسل ہے، ریلوے اسٹیشن سے پارسل منگوالیا جائے۔

....

نذر والے مضمون کے متعلق میں نے جو استدعا اِس سے پہلے اور اُس سے بھی پہلے عریضہ میں پیش کی تھی، اُس کا جواب کچھ نہیں ملا، اس مسئلہ کی تنقیح کی بڑی شدید ضرورت ہے، لہٰذا اس کے لیے ضرور کسی نہ کسی طرح وقت نکالیے![1]

گذشتہ ہفتہ میں دہلی گیا تھا، وہاں مولوی عتیق الرحمٰن صاحب ناظم ''ندوۃ المصنفین'' اور مولوی سعید احمد اکبرآبادی ایم۔اے۔ وغیرہ سے کچھ آنمحترم کا ذکر آگیا۔اس سلسلہ میں انھوں نے کہا تھا کہ اگر مولانا وقت نکال کر ترمذی پر ایک مبسوط حاشیہ بقیہ صفحہ ۷۹ پر

(۱)''احکام النذر لاولیاء اللہ وتفسیر ما اہلّ بہ لغیر اللہ'' کے نام سے نذر پر ایک نہایت محققانہ رسالہ تحریر فرمایا، جو شوال وذیقعدہ ۱۳۵۸ھ کے ''الفرقان'' میں شائع ہوا تھا۔اب پھر اس رسالے کی کمپوزنگ وغیرہ ہوچکی ہے، اور عنقریب مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ (مدرسہ مرقاۃ العلوم) سے شائع ہونے والا ہے۔

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

مولانا ابوالحسن قاسمی شیخ الحدیث دارالعلوم ماٹلی والا

۱۵؍ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ = ۲۲ستمبر ۲۰۱۳ء کو صوبۂ گجرات کی معروف دینی درس گاہ دارالعلوم ماٹلی والا - بھروچ - کے شیخ الحدیث مولانا ابوالحسن قاسمی تقریباً ۸۷ برس کی عمر میں اس دنیا سے رحلت فرما گئے، إنا لله و إنا إليه راجعون.

صوبۂ جھارکھنڈ کے ضلع گڈا کے ایک گاؤں سرمد پور کے باشندہ تھے، ۲۷؍رمضان ۱۳۴۷= ۱۰؍مارچ ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے، والد کا نام محمد حسین انصاری تھا، والدہ کے سایۂ عاطفت سے بچپن ہی میں محروم ہوگئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے مدرسہ محمودیہ سَرَیا میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور سند فراغ حاصل کی۔ ممتاز اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ -متوفی ۱۳۷۶ھ = ۱۹۵۷ء-، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی -متوفی ۱۳۷۴ھ = ۱۹۵۵ء- اور شیخ المعقول والمنقول علامہ ابراہیم بلیاوی -متوفی ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۷ء- جیسے اساطین علم وفضل ہیں۔

مولانا نے تحصیل علم کے بعد درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، اور تقریباً پوری عمر گجرات میں گزار دی، ۱۹۵۲ء میں گجرات وارد ہوئے اور وہاں کی خاک ان کی دامن گیر ہوگئی، پہلے دارالعلوم چھاپی میں مسند درس سنبھالی، ۱۳۹۳ھ = ۱۹۷۳ء میں گجرات ہی کے ایک دوسرے مدرسے دارالعلوم ماٹلی والا چلے گئے، اور وہاں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے، اور تقریباً ۴۰ سال یعنی زندگی کے آخری لمحے تک قال اللہ وقال الرسول کا زمزمہ بلند کرتے رہے۔ وہیں انھوں نے زندگی کی آخری سانس لی، اور اسی کی خاک میں آسودۂ خواب ہوئے۔

مولانا نے حضرت محدث الاعظمیؒ سے حدیث شریف کی سند واجازت حاصل کی تھی، شعبان ۱۴۰۶ھ = ۱۹۸۶ء میں دارالعلوم ماٹلی والا کے سالانہ جلسے کی تقریب میں شرکت کے لیے حضرت محدث الاعظمیؒ بھروچ تشریف لے گئے، ۳؍دن وہاں قیام فرمایا، اس موقع پر وہاں کے بہت سے اہل علم نے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے سند واجازت حاصل کی، اسی موقع پر مولانا ابوالحسن صاحب بھی صحاح ستہ کی اول وآخر حدیث پڑھ کر محدثین کے طریقے کے مطابق سند واجازت سے سرفراز ہوئے۔ اس سفر

میں ہمارے رفیق درس مولوی محمد عاصم - استاذ مدرسہ تعلیم القرآن، بسم اللہ نگر، بنگلور - حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خادم کی حیثیت سے آپ کے ساتھ تھے، واپس آنے کے بعد ان کا بیان تھا کہ جب مولانا بخاری شریف لے کر حضرت کے سامنے پڑھنے کے لیے بیٹھے تو ان کے اوپر ایسی کپکپی طاری ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کتاب گر جائے گی، یہ دیکھ کر انھوں نے (مولوی عاصم نے) نیچے سے کتاب کو سہارا دیا۔

آج سے تقریباً ۷-۸ سال پہلے خاکسار کو مولانا ابوالحسن مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، ایک موقع سے دارالعلوم ماٹلی والا جانا ہوا تھا، مدرسہ کے مہتمم مولانا اقبال احمد صاحب نے بنفس نفیس پورے مدرسہ کی زیارت کروائی، اس کے بعد احقر اور اس کے رفیق سفر مولوی خطیب الاسلام مولانا کی قیام گاہ پر پہنچے تو بہت تپاک اور خوش اخلاقی سے ملے، گھر کے اندر لے جا کر ایک کمرے میں بٹھایا، پر تکلف ناشتہ کرایا، اور دیر تک گفتگو فرمائی، میں ان کی خوش اخلاقی، سادگی، شرافت و سنجیدگی، اور تواضع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔

رب کریم سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے، حسنات کو قبول اور زلات سے عفو و درگزر فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل اور جس دارالعلوم سے وابستہ تھے اس کو نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۷۷ کا بقیہ

(بطرز شرح مسلم نووی) تیار فرما سکیں، جس میں وہ قرض بھی ادا ہو جائے جو ''تحفۃ الاحوذی'' کی اشاعت کے بعد حنفیوں پر عائد ہو گیا ہے، تو ''ندوۃ المصنفین'' تحشیہ کا معاوضہ ادا کر کے اس کو خاص اہتمام سے چھپوا سکتا ہے۔ اور اس بارے میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تو مولانا کی مرضی دریافت کر کے لکھنا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر اس کے لیے وقت نکل سکے تو علم اور دین کی بڑی خدمت ہوگی اور وقت کی ایک بڑی ضرورت انشاء اللہ پوری ہو جائے گی، جس کو پورا کرنے والے شاید آئندہ پیدا ہی نہ ہوں۔؟

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۹/ رجب المرجب ۵۸ھ

المآثر کی ڈاک

محترمی مولانا رشید احمد صاحب زادمجدکم

السلام علیکم

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے

میں نے چند برس پہلے حضرت الاستاذ علامہ اعظمیؒ کی بلند پایہ علمی ودینی خدمات پر انگریزی میں ایک مضمون (A Colossus of Hadith Litratur) کے عنوان سے لکھا تھا جو حیدرآباد کے مقتدر رسالہ اسلامک کلچر میں شائع ہوا۔ میں نے مضمون کی کاپی آپ کو ارسال کی تھی۔

بعد ازاں یہ مضمون دہلی کے ایک اسلامی ویب سائٹ دی مینار یٹ(The IOS Minaret) میں شائع ہوا۔اس ویب سائٹ کو تقریباً اسی ہزار افراد ہر مہینہ پڑھتے ہیں۔اس مضمون کو بعض اسلامی اداروں نے انٹرنیٹ پر شائع کردیا۔

حال ہی میں میں نے علامہ اعظمی کے رسالہ ''دارالاسلام اور دارالحرب'' کی انگریزی میں تلخیص اور ترجمہ کیا ہے جو حضرت الاستاذ اور نفس مضمون پر مختصر تعارف کے ساتھ دی مینار یٹ میں یکم نومبر ۲۰۱۳ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون کی کاپی منسلک ہے۔

ویب سائٹ پر یہ مضمون (www.ios minaret. org) کے حوالہ سے پڑھا جاسکتا ہے۔علامہ اعظمی کے جو شاگرد، نیازمند اور مداح (جن کی تعداد ہندوستان اور بیرون ہند میں ہزاروں سے متجاوز ہے) جو انگریزی سے واقف ہیں ان کو یہ اطلاع فراہم کی جاسکتی ہے۔

نیازمند

عبدالرحمٰن مومن

یکم نومبر ۲۰۱۳ء